فہرست

لمعات

قائداعظمؒ کا پاکستان	ادارہ	3
دروس القرآن (سورہ فاتحہ)	غلام احمد پرویز	7
فریب مغربی جمہوریت اور اس فریب سے بچ نکلنے کا راستہ	ڈاکٹر سید عبدالودود	23
پرویزؒ صاحب اور فہمِ قرآن۔۔ تحریف معنوی یا ارتقائے فکر۔۔۔!	بشیر احمد عابد، کویت	41
حکمت کی باتیں	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	54

ENGLISH SECTION

BAZM-E-TOLU-E-ISLAM TORONTO

By Abdus Sattar Ghazali 1

WORKING TOGETHER: SOME THOUGHTS AND REFLECTIONS

By Mansoor Alam 7

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قائداعظمؒ کا پاکستان

تحریک پاکستان کے بلند و بالا مقاصد اور قرآنی پیش نہاد نے قائداعظم اور طلوع اسلام میں قلب و نظر کی جو گہری وابستگی قائم کی تھی وہ آج بھی ہمارے لئے یادرفتہ کا محبوب سرمایہ ہے۔ قرآنی نظام کی وہ منزل مقصود جس کے لئے بابائے ملت نے دس کروڑ مسلمانوں کو ایک پرچم تلے منظّم ہونے کی دعوت دی تھی آج بھی بدستور ہماری مقدس آرزوؤں کا مرکز و محور ہے اور حیات ملی کے یہی وہ محبوب تقاضے ہیں جو حیات قائداعظم اور تحریک پاکستان کے پس منظر کو پوری وضاحت سے منظر اشاعت پر لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

پاکستان میں کس قسم کا نظام، تحریک پاکستان کے قائدین کے پیش نظر تھا، یہ وہ سوال ہے جس کی اہمیت آج بھی بجنسہٖ محسوس کی جارہی ہے بلکہ وقت اور حالات کے تقاضوں نے آج اس کی اہمیت کو پہلے سے بھی کہیں بڑھا دیا ہے اور ہم بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اگر اس سوال کا جواب قائداعظم کی تقاریر اور بیانات سے منظر عام پر لایا جا سکے تو اس سے بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی، ذہنوں سے بہت سا گرد و غبار دھل جائے گا اور پاکستان کی تعمیر کا وہ نقشہ نکھر کر سامنے آ جائے گا جو قائداعظم کا منتہا و مقصود تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تحریک پاکستان کے داعی اعظم کے وہ دوٹوک اور قطعی اعلانات و بیانات منظر اشاعت پر لائے جائیں (جنہیں عام طور پر عمداً نظر انداز کر دیا جاتا ہے) جو مطالبہ پاکستان اور اس کے طرز حکومت کے بارے میں ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کے مصداق ہوں۔ آیئے اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے قائداعظم کے اس اہم انٹرویو کو پھر روشنی میں لائیں جو 19 اگست 1941ء کو حیدرآباد دکن میں، عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء نے لیا اور جس کی تفصیل اورینٹ پریس کے ذریعے اخبارات میں شائع ہوئی۔ ہم سوالات اور ان کے جوابات کو بجنسہٖ پیش کرتے ہیں۔

سوال۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب (Religion) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا

اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے' البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اشتراکیت۔ بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک۔ دراصل اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال۔ ترکی حکومت تو سیکولر اسٹیٹ ہے۔ کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے؟

(اس سوال کا پہلا حصہ تو ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے لیکن دوسرے حصہ میں جو کچھ قائداعظمؒ نے کہا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر بار بار غور کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ جواب ان تمام پیچیدگیوں کو صاف کر دیتا ہے جو اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپؒ نے جواب میں فرمایا۔)

جواب۔ ''ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر اسٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز تو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔''

ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ

(1) اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔

(2) اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص کی یا ادارہ کی۔

(3) قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

(4) اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

سوچئے کہ کیا اسلامی حکومت کے اصول و معانی کے متعلق اس سے زیادہ صاف، واضح اور جامع بات کچھ اور بھی کی جا سکتی ہے۔

قائداعظم کے ایسے ہی صدہا فرمودات مجلّہ طلوع اسلام کے ہزارہا صفحات میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان منتشر موتیوں میں سے کچھ اور گہرہائے تابدار ذیل میں آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ انہی سے یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ حصول پاکستان سے مقصد ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جس میں قرآنی نظام حیات ممکن ہو، جس میں اسلام ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آئے۔

☆ ''اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ یہ ضابطہ حیات مذہب، معاشرت، تجارت، عدل، فوج، سول، فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لیئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا سوال ہو یا انفرادی حقوق کا، اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا، اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا، ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں، اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہئے''۔ (عید کا پیغام۔ ۴۵ء)
(طلوع اسلام جنوری ۶۰ء صفحہ ۳۷)

☆ ''وہ کیا چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایک رشتے میں پرو رکھا ہے، وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملی عمارت کی بنیاد ہے، وہ کونسا لنگر ہے جس سے ان کی کشتی بندھ رہی ہے؟ ان سوالوں کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ محکم رشتہ، یہ سنگین چٹان، یہ آہنی لنگر خدا کی وہ کتاب عظیم (قرآن کریم) ہے جس نے تمام مسلمانوں کو جسد واحد بنا رکھا ہے، مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں وحدت زیادہ ہوتی جائے گی، اس لئے کہ ہمارا خدا ایک، خدا کی کتاب ایک، اس کا رسولؐ ایک، اس لئے ہماری ملت بھی ایک ہے''
(مسلم لیگ کراچی سیشن میں تقریر) (طلوع اسلام جنوری ۶۰ء صفحہ ۶۹)

☆ ''اس اسکیم کو پیش کرتے ہوئے جو اصول میرے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں تھا وہ مسلم ڈیماکریسی کا اصول تھا یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس ذات اقدس و اعظم حضور رسالتمآبؐ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں مضمر ہے جس نے ہمیں قانون (خداوندی) عطا فرمایا، آیئے ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد سچے اسلامی اصولوں پر رکھیں، ہمارے خدا نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہماری مملکت کے معاملات باہمی

مشاورت سے طے پائیں۔'' (سبی دربار بلوچستان۔۱۴فروری ۴۸ء) (طلوع اسلام جنوری ۶۱ء صفحہ ۴۲)

☆''پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے' لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور سانس لے سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پاسکیں اور جہاں اسلام کے عدل عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جاسکیں۔'' (خالق دیناہال کراچی میں خطاب۔۱۱/ اکتوبر ۴۷ء) (طلوع اسلام جنوری ۶۱۔صفحہ ۲۱)

☆''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں'' (اسلامیہ کالج پشاور۔۱۳جنوری ۴۸ء)

☆''میں تو یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ لوگوں کو اس استفسار کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا نہیں؟ اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کی نظیر دنیا میں کوئی پیش نہیں کرسکتا۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح کارآمد ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پیشتر تھے'' (سندھ بار ایسوسی ایشن۔۲۵ جنوری ۴۸ء) (طلوع اسلام مارچ ۴۸ء۔صفحہ ۱۰۰)

☆''اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ سب اس باب میں مجھ سے متفق ہوں گے' ہم خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں آخرالامر مسلمان ہیں لہذا اگر تم ایک ملت بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبجاتی تفریق کو خیرباد کہئے صوبجاتی تفریق اور مذہبی فرقہ بندیاں' شیعہ' سنی وغیرہ لعنت ہیں۔ (جلسہ عام ڈھاکہ میں تقریر۔۲۱مارچ ۴۸ء) (طلوع اسلام جنوری ۶۱ء صفحہ ۴۳)

☆''مغرب کے معاشی نظام نے نوع انسان کے لئے لاینحل مسائل پیدا کر دیئے ہیں' اس نظام کی رو سے ہم اپنا نصب العین یعنی عوام کی مرفہ الحالی اور اطمینان کبھی حاصل نہیں کرسکتے' لہذا ہمیں اپنا راستہ آپ تراشنا چاہئے اور دنیا کے سامنے وہ نظام پیش کرنا چاہئے جو اسلام کے نوع انسانی کی مساوات اور عدل عمرانی کے تصور پر مبنی ہو'' (آخری تقریر اسٹیٹ بنک۔یکم جولائی ۴۸ء) (طلوع اسلام دسمبر ۵۵ء صفحہ ۹)

☆''میں اس موقع پر ان جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کے لئے جو عوام کی محنت سے پھلے پھولے ہیں' یہ انتباہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ ذہنیت بدکرداری اور حرام خوری پر مبنی ہے جس نے انہیں خودغرضی کی اس انتہا تک پہنچا دیا ہے کہ ان سے کسی معقول روش کی توقع نہیں کی جاسکتی' عوام کو اپنے مفادات کی خاطر استعمال کرنا ان کی فطرت میں داخل ہے وہ اسلام کی ہدایات فراموش کر چکے ہیں اور اس خودغرضی و مفاد پرستی نے انہیں اغیار کے مقاصد کا آلہ کار بنا رکھا ہے'' (خطبہ صدارت مسلم لیگ اجلاس دہلی۔۲۴اپریل ۴۳ء) (طلوع اسلام جنوری ۶۶ء صفحہ ۴۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(نواں باب)

سورۃ الفاتحۃ

(آیت 7 اور خلاصہ)

عزیزانِ من! آج کے درس میں ہم سورۃ الفاتحۃ کی آخری یعنی ساتویں آیت پر آ گئے ہیں: **غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لاَ الضَّآلِّيْنَ** (1:7)۔ اس سے پہلے کی دو آیات یہ تھیں: **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ o صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** (1:5-6) یعنی یہ شدتِ آرزو دعا کی شکل میں ہمارے لبوں پر (آئی تھی) کہ اے ہماری ربوبیت کے ذمے دار! تو ہماری رہنمائی ایک توازن بدوش سیدھے راستے کی طرف کر۔ چونکہ یہ چیز Abstract (غیر محسوس) شکل میں سامنے آئی تھی' اُسے ایک محسوس (Concrete) شکل میں پیش کرنے کے لیے یہ کہا کہ یہ اُن لوگوں کی راہ ہے جسے قرآن کریم نے **اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** کہا ہے یعنی ان کی راہ جن پر تیری نعمتوں کی' تیرے انعامات کی نوازشِ بے بہا ہوئی۔ اُس کے ساتھ اگلی آیت ہے کہ **غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لاَ الضَّآلِّيْنَ** (1:7)۔ ان آیتوں کا ترجمہ عام طور پر ہمارے ہاں یہ کیا جاتا ہے کہ ''دکھا ہم کو راہ سیدھی' راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے اپنا انعام کیا' نہ اُن کی جن پر تیرا غضب ہوا یا جو گمراہ ہوئے۔''

قرآنِ حکیم کے مروّجہ تراجم سے پیدا ہونے والی غیر قرآنی سوچ

نظر بظاہر اس ترجمہ میں کوئی بات قابلِ اعتراض نظر نہیں آتی لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس سے خدا کے متعلق بڑا غلط تصور سامنے آتا ہے یعنی ہم خدا سے یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اُن لوگوں کی راہ دکھا' جن پر تیرا انعام ہوا۔ یہاں تک تو بات صاف ہے لیکن اس کے بعد ہم اس سے یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں کی راہ نہ دکھا دینا' جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہو گئے' یعنی معاذ اللہ' ہم کہہ یہ رہے ہیں کہ خدا جہاں ان لوگوں کو اس راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے' جو اس کے انعامات سے نوازے گئے ہیں' وہ ان کی طرف بھی راہنمائی کر دیا کرتا ہے' جن پر اس کا غضب وارد ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔ تو ہم اُس سے کہہ رہے ہیں کہ ہماری راہنمائی ان کی طرف کرنا' جن پر تیرا انعام ہوا' دیکھنا کہیں ان کی طرف راہنمائی نہ کر دینا' جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہو گئے۔ معاذ اللہ' معاذ اللہ' خدا کے متعلق

آپ نے دیکھا کہ یہ تصور کس قدر غلط اور گمراہ کن ہے کہ خدا اُن لوگوں کی طرف راہنمائی کرے گا جن پر اُس کا غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔ اسی ترجمے پر کیا موقوف ہے' آگے چل کر اگر آپ نے میرے دوسرے دروس بھی سنے یا اور لٹریچر بھی پڑھا' تو آپ کے سامنے اس قسم کی خونچکاں داستانیں بھی آئیں گی' جن میں خدا کی ایک صفت "المضل" بھی بیان کی گئی ہے یعنی گمراہ کرنے والا: **استغفر اللہ**۔ قرآن کی کئی آیات کی اس قسم کی تفسیریں دی گئی ہیں' جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اس قسم کی آیات کی صحیح تفسیر کا صحیح مفہوم آپ کو ''مفہوم القرآن'' میں ملے گا اور میری ''کتاب التقدیر'' [1] میں بھی اس قسم کی تمام آیات کا صحیح مفہوم مل جائے گا۔

قرآن حکیم کے حقائق کو سمجھنے کے لیے اس کے پیش کردہ تقابلی جائزہ ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے

میں اس وقت کہنا صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ ترجمہ کیا جائے کہ ''دکھا ہم کو ان لوگوں کی راہ' جن پر تو نے انعام کیا' نہ کہ ان لوگوں کی جن پر تو نے اپنا غضب کیا اور وہ گمراہ ہوئے'' تو اس سے خدا کے متعلق ایک بڑا غلط اور گمراہ کن تصور ذہن میں آتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں آیات کا یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم اپنے حقائق و معارف کو' جیسا میں نے پہلے بھی کہا تھا' اضداد کے ذریعے واضح کرتا ہے اور یہ طریقہ بڑا دلنشیں اور مؤثر ہوتا ہے۔ مثلاً وہ نور اور ظلمت' تاریکی اور روشنی' دھوپ اور سایہ' نابینا (اندھا) اور بینا اس قسم کے الفاظ ایک دوسرے کے مقابل لا کر اپنے مقصد کی وضاحت کرتا ہے۔ یہی انداز اس نے زیرِ درس آیت میں بھی اختیار کیا ہے۔ ان دو آیات میں اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ ''ہمیں ان لوگوں کی راہ دکھا' جو منعم علیہ تھے۔ وہ لوگ مغضوب علیہ اور ضالین نہیں تھے۔ یعنی وہ ایسے تھے' ایسے نہیں تھے''۔ جن لوگوں کی راہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں' ایک طرف ہم نے Positive (مثبت) طریق پر ان کی خصوصیت بیان کی کہ وہ منعم علیہ تھے' ان پر تیرے انعامات کی بارش ہوئی تھی' اور دوسری طرف ہم منفی (Negative) طور پر بھی یہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ وہ نہیں تھے کہ جن پر تیرا غضب ہوا' جو گمراہ ہوئے تھے۔ یہ نہیں کہ تو ہمیں ان لوگوں کی راہ نہ دکھا دینا جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہو گئے بلکہ کہا یہ ہے کہ ہم جن لوگوں کی راہ کی طرف راہنمائی چاہتے ہیں یہ وہ لوگ تھے جن پر تیرے انعامات کی بارشیں ہوئیں' یہ وہ لوگ نہیں تھے کہ جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہو گئے۔ اس سے مفہوم واضح ہو گیا: ہماری آرزو' ہماری تمنا' ہماری دعا یہ ہوئی کہ ہم اُن لوگوں کے راستے سے بچنا چاہتے ہیں' جن پر خدا کا غضب ہوا یا جو ضالین تھے۔

---

[1] ''کتاب التقدیر'' (دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا' قابلِ فہم' بصیرت افروز' حل)۔ اس کتاب کے مضامین کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے اس کتاب کے ابواب: قانونِ مشیت (ص ص 235-195) **تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ** (ص ص 319-302)' **اور یغفر لمن یشآء و یعذب من یشآء** (ص ص 341-320)

اللہ تعالیٰ کی نسبت سے غضب کا وہ مفہوم جو انسانوں کے لیے سمجھا جاتا ہے درست نہیں

لفظ ''غضب'' کے بنیادی معنوں میں شدت، قوت، حرارت، غلبہ، استیلا [1] اور گرفت کی محکمیت پائی جاتی ہے۔ جب یہ لفظ انسانوں کے لیے بولا جائے گا تو اس میں غصہ اور غضب آلود جذبات کا ہیجان مقصود ہوگا۔ ہمارے ہاں ''مغضوب الغضب'' ایک عام سی ترکیب ہے جو اس شخص کے لیے بولی جاتی ہے جو اپنے شدتِ جذبات سے پاگل ہو گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ تو انسانی جذبات سے بلند اور منزہ ہے، اس لیے جب اس لفظ کی نسبت خدا کی طرف کی جائے گی تو اس سے مراد خدا کے قانونِ مکافات کی محکم گرفت ہوگی۔ خود اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا ہے کہ

حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

غضب کا مفہوم قانونِ مکافات کی گرفت کا نتیجہ ہے

یہی جو تعزیرات فطرت ہیں، انہیں ہی خدا کا غضب کہا گیا ہے، کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس لفظ کے اندر شدت اور قوت کے ساتھ گرفت اور مواخذہ کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے دیگر مقامات پر اسی مفہوم کو دیگر الفاظ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (85:12) یاد رکھو! خدا کی گرفت بڑی محکم ہوتی ہے۔ دوسرے مقام پہ فرعون [2] کے متعلق کہا ہے کہ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّ بِیْلًا (73:16) ہم نے فرعون کو بڑی محکم گرفت سے پکڑ لیا۔ یہی مفہوم خدا کے غضب کا بھی ہے یعنی وہ تباہی اور بربادی جو اس کے اٹل قانونِ مکافات کی رو سے ان قوموں پر واقع ہوتی ہے یا ہوئی ہے، جنہوں نے اس کے صحیح اقدار اور اصولوں سے سرکشی برتی اور تباہ کن روش پر چلتے رہے۔ اس کے نتیجے میں ان پر تباہی آئی، جسے خدا نے گرفت سے تعبیر کیا ہے، یہ خدا کا غضب ہے۔ جب وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت میں آئے تو کہا گیا ہے کہ وہ ''مغضوب علیہ'' تھے، ان سے مواخذہ ہوا تھا، وہ پکڑے گئے تھے، ان کی گرفت ہوئی تھی اور اس گرفت کے نتیجے میں ان قوموں کی تباہی [3] ہوئی۔

---

[1] غلبہ

[2] (ا)۔ پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد دوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1983ء، ص ص 155 تا 156۔
(ب) کشمکش حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء

[3] غضب الٰہی کی مستوجب قوم کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ وہ برائیوں میں مبتلا ہیں لیکن کوئی کسی کو اس سے منع نہیں کرتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک بہت بڑا فریضہ ہے، لیکن جب کسی قوم میں عیوب اس قدر عام ہو جاتے ہیں کہ سوسائٹی ان عیوب کو عیوب ہی نہیں سمجھتی، کوئی کسی کو روکتا ہی نہیں یا اخلاقی جرأت اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ کسی کو روکنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی یا منافقت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ انسان ہر دلعزیز ہونے کے لیے ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا جاتا ہے تو اس وقت اس قوم کو خدا کا غضب گھیر لیتا ہے۔

مغضوب علیہ کی پہچان خوف وحراس' غلامی کی لعنت میں گرفتار اور غور تدبر سے عاری ہونا ہے

عزیزانِ من! اس مفہوم کے بعد اب ہم وہ چند آیات سامنے لاتے ہیں' جن میں ''مغضوب علیہ'' کا یہ لفظ استعمال ہوا ہے یا بتایا گیا ہے کہ اس کی تفصیل وتشریح کیا ہے۔ جن قوموں پر خدا کا غضب ہوتا ہے' وہ کس طرح پہچانی جاتی ہیں' ان کی کیفیت وحالت کیا ہوتی ہے' ان کا انجام کیا ہوتا ہے؟ یہ بات صرف تاریخی شواہد سے' سب سے پہلے' ہمارے سامنے آئے گی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے درس اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (1:4) میں جب ہم نے سب سے پہلے بنی اسرائیل کی داستان کا ذکر کیا تھا اور اس میں یہ کہا تھا' کہ پہلی نعمت جس کی یاد ان کو دلائی گئی' وہ یہ تھی کہ انہیں فرعون کے پنجہ غلامی سے رستگاری نصیب ہوئی' اس سے نجات ملی' تو یہ ایک منفیانہ سی چیز تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی مستبد حاکم کے پنجہ غلامی سے نجات حاصل ہونا خدا کا پہلا انعام ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا تھا یہ منفیانہ چیز ہے۔ مثبت طور پر کہا کہ پھر اس قوم کو ہم نے وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (2:47) ان کی ہم عصر اقوام' پر فضلیت اور برتری عطا کی۔ گویا کسی قوم کا آزاد ہونا اور اس کے بعد اپنے ہم عصر اقوام کے مقابلے میں برتری' غلبہ' فضلیت حاصل ہونا' خدا کا انعام بتایا گیا ہے اور اس کے بعد اسی قومِ بنی اسرائیل کے متعلق کہا کہ جب انہوں نے خدا کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر خود ساختہ راستے اختیار کیے' اس کے قوانین واقدار سے سرکشی برتی' تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَ الۡمَسۡکَنَۃُ ٭ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ (2:61) ان پر ذلت ومسکنت کا عذاب نازل ہوگیا اور یہ خدا کا غضب تھا۔ دوسری جگہ اس کی مزید وضاحت کردی۔ اسے ذِلَّۃٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (7:152) کہا یعنی اس سے یہ بھی واضح کردیا کہ وہ جو ذلت اور مسکنت کا عذاب ہے وہ اسی دنیا میں ان کے اوپر وارد ہوگیا تھا اور یہ تھا خدا کا غضب۔

ذلت کے مقابلے میں حیاتِ سعی وپیہم اور حرکت مسلسل کی اہمیت وافادیت

''ذلت'' کا لفظ ہر قسم کی محتاجی' کمزوری' محکومی' بے کسی' بے بسی' بے چارگی' درماندگی اور پستی کے معنوں میں آتا ہے۔ وہاں (2:47) میں انعام کے طور پر دیگر ہم عصر اقوام پر افضلیت بتائی گئی تھی اور یہاں (2:61) میں کہا کہ ان پر ذلت اور پستی کی مار ماری گئی۔ یہاں پہلا لفظ قرآن نے ''ذلت'' کہا ہے۔ وہ قوم ذلیل ہوگئی' دوسرا لفظ مسکنت کہا ہے۔ (2:61) میں یہ لفظ بڑے گہرے غور وتدبر کا محتاج ہے۔ زندگی حرکت اور حرارت کا نام ہے یعنی شاہراہِ حیات پر مسلسل رواں دواں چلتے رہنے کا نام۔ اسی کو سعی پیہم یا جدوجہدِ دوام کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں ''حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں''۔ [1] یہ چلتے چلے جانا' چلتے چلے جانا

---

[1] ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں (اقبالؒ: بالِ جبریل)

ہے اور اس طرح زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے چلے جانا۔ زندگی نام ہی حرکت کا ہے۔

فکری جمود کی بنا پر زندگی کی ارتقا کے رک جانے کا دوسرا نام جہنم ہے

جو قوم کسی مقام پر رک کر کھڑی ہو جائے' وہ زندگی کی حرارتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہ ایک مقام پر رک کر کھڑی ہونے والی قوم' درحقیقت' اسی مقام پہ کھڑی نہیں ہوتی بلکہ غور سے دیکھا جائے تو وہ پیچھے ہٹ رہی ہوتی ہے چونکہ چلنے والی قومیں اس سے بہت آگے بڑھ جاتی ہیں۔ لہٰذا ''مسکنت کسی قوم کی ایسی حالت کا نام ہے جہاں وہ آگے بڑھنے سے رک جائے۔'' آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ قرآنِ کریم میں جہنم کے لیے لفظ جحیم بھی آیا ہے اور جحیم کے معنی ہوتے ہیں ''راستے کی روک' جہاں کوئی آگے بڑھنے سے رک جائے''۔ جہنم اس کیفیت کا نام ہے ''جہاں کسی انسان کی ذات یا کوئی قوم آگے بڑھنے سے رک جائے''۔ ایک مقام پر ٹھٹھر کر رہ جائے۔ خدا کے اس اصول کو ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جو نعمتیں کسی قوم کو حاصل ہوں وہ ان سے کبھی نہیں چھینی جاتیں' جب تک وہ قوم اپنی نفسیاتی دنیا میں تغیر پیدا نہ کرے۔ لہٰذا جو قوم کسی ایک مقام پر رُک جاتی ہے' اُس سے یہی مراد نہیں کہ اس کے پاؤں چلنے سے رُک جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس میں فکری جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھنا' سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ وہ تقلید کا مسلک اختیار کر لیتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتی ہے کہ زندگی کے حقائق اور مسائل کے متعلق جو کچھ سوچا جانا تھا' وہ سوچا جا چکا ہے' سفرِ حیات میں جس قدر مسافت طے کرنا تھی' وہ طے کی جا چکی ہے' یہی ہماری منزل اور منتہائے مقصود ہے' ہمیں اس سے آگے نہیں بڑھنا۔ اس کے لیے ان کے پاس سند صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ وہ مسلک ہے جسے ہمارے آباء واجداد یعنی اسلاف نے اختیار کیا تھا۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر اس عقیدے کی شدت سے تردید کی ہے اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ جو قوم سمجھنا' سوچنا چھوڑ کر' ذہنی اور فکری طور پر' مسکنت اور جمود کے عذاب میں گرفتار ہو جائے' وہ قوم موجبِ غضب الٰہی ہو جاتی ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں قومِ عاد کی تباہی کی داستان کے سلسلے میں فرمایا کہ جب ان کی طرف خدا کے پیغمبر حضرت ہودؑ نے انہیں خدائے واحد کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی' تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے اسلاف کا مسلک چھوڑ دیں؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ہودؑ کی زبان سے یہ کہلوایا کہ تمہاری یہ روش اور اس پر قائم رہنے کی ضد اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ (7:71) تم خدا کے غضب میں آ چکے ہو' تم مغضوب علیہ ہو چکے ہو۔

قرآن حکیم کی آئینہ نما تعلیم ہمیں قدم قدم پر دعوتِ فکر دیتی ہے

عزیزانِ من! جو قوم آگے بڑھنے سے انکار کرے' جس کی نگاہیں صرف ماضی کی طرف رہیں' جو کسی ایک مقام پر جامد اور ساکن

کھڑی ہو جائے' اور اس کے جواز میں سند یہ پیش کرے کہ یہ ہمارے اسلاف کا راستہ ہے' ہم اس کو نہیں چھوڑنا چاہتے' تو قرآن نے کہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ یہ اس امر کی شہادت ہے کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو چکا ہے' تم مغضوب علیہ قوم بن چکے ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سنو! اس قسم کی روش پر ضد کرنے والی قوم جب مغضوب علیہ ہو جاتی ہے تو اس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا [1] (7:72) وہ چونکہ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی تھی' اس لیے اس قوم کی جڑ کٹ گئی۔ اس طرح مغضوب علیہ قوم وہ ہے جو زندگی کی تمام شادابیوں اور سرفرازیوں سے محروم ہو جاتی ہے' جس میں حرکت اور حرارت باقی نہیں رہتی اور اس کے شجر حیات کی جڑ تک کٹ جاتی ہے۔ یہ ہوتی ہے نشانی اس قوم کی' جو خدا کے غضب کی مستحق ہو چکی ہو۔

منعم علیہ قوم کی جرأت و استقلال ہمیشہ بمثل چٹان ہوتی ہے

اب ذرا آگے بڑھیے۔ آپ کو یاد ہے کہ ''منعم علیہ'' قوموں کے سلسلے میں قرآن نے یہ بھی کہا تھا کہ ان اقوام کے افراد مجاہدین ہوتے ہیں۔ جب ان سے کسی نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے خلاف تمہارے دشمنوں نے کتنا بڑا لشکر جرار تیار کر رکھا ہے' ان سے ڈرو تو اس سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ انہوں نے کہا کہ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (3:173) اگر انہوں نے اتنا لشکر عظیم جمع کر رکھا ہے تو ہم اس سے ڈرتے نہیں ہیں' ہمارے پاس وہ سروسامان اور وہ قوت و تقویت ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہی نہیں ہو سکتی جو خدا کے قوانین اور اقدار کے خلاف چلتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ یہ لوگ صرف میدانِ جنگ سے خدا کی نعمتوں کی جھولیاں بھر بھر کر واپس لوٹے۔ ایک نقشہ یہ تھا۔ اس کے برعکس متضاد مثال دینے کے لیے قرآن نے یہ کہا کہ کشمکش حق و باطل میں' یہ جو کفر اور اسلام کی جنگ ہوتی ہے' اس میں اگر کوئی میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھتا ہے' تو اس پر خدا کا غضب وارد ہو جاتا ہے۔ جنگِ بدر کا واقعہ [2] اس کی بہترین مثال ہے۔

جنگِ بدر کا میدان منعم علیہ قوم کی ایک لازوال مثال ہے

عزیزانِ من! غور کیجیے کہ قرآنِ کریم نے یہاں پہنچ کر کس قدر محسوس (Concrete) مثال دی ہے۔ جنگ بدر کا واقعہ [2] ہماری تاریخ میں ہی نہیں' دنیا کی تاریخ کے اندر بھی ایک نادر واقعہ ہے۔ حق و صداقت کی علمبردار یہ قوم' مکے کو چھوڑ کر مدینے آ گئی لیکن مخالفین نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر ان کے پیچھے آ گئے۔ یہی تھا وہ لشکرِ جرار جس کے متعلق اس آیت میں مخالف

---

[1] اور جن لوگوں نے ہمارے قوانین کو تسلیم نہیں کیا تھا' انہیں جھٹلایا تھا' ان کی جڑ کاٹ ڈالی۔

[2] 17 رمضان 2ھ بمطابق 13 مارچ 624م۔

لوگوں نے حق وصداقت کی اس علمبردار قوم کے متعلق کہا تھا کہ ان سے ڈرو۔ یہ مدینے میں' یوں کہیے کہ پناہ گزینوں کی ایک مختصر سی جماعت تھی' اتنی مختصر کہ وہ میدانِ جنگ میں پہنچی ہے' تو تاریخ کے اعتبار سے تین سو یا تین سو بارہ کے قریب ان کے کل سپاہی تھے۔ اس حالت میں یہ اتنی مختصر سی جماعت تھی: بے کس و بے بس' بے سروسامان' پناہ گزیں' لیکن یہ وہ جماعت تھی' جسے قرآن نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗٓ (48:29) کہہ کر پکارا ہے۔ یہ وہ جماعت تھی جنہوں نے خدا کے ہاتھ اپنی جان اور مال بیچ دی ہوئی ہے۔ یہ وہ تھی کہ دشمنوں کے لشکر جرار سے ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ جماعت اس میدان میں گئی۔ اب ظاہر ہے کہ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس جماعت میں سے کوئی فرد' دشمن کے مقابلہ سے منہ موڑ کر' پیٹھ دکھا کر' میدانِ جنگ سے بھاگ جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ہمارے لیے' آنے والوں کے لیے' یہ بتانے کے لیے' کہ حق و باطل کے معرکے میں پیٹھ دکھانے والے کا کیا حشر ہوتا ہے' میدانِ جنگ بدر کا نقشہ سامنے لا کر یہ کہا کہ یاد رکھو' سن رکھو! اس صف میں کھڑے ہونے والے دشمن کے مقابلے میں' ایک بنیانِ مرصوص کی طرح' یہاں کھڑے ہیں۔ قرآن نے ان کو بنیان مرصوص کہا ہے' سیسہ پلائی ہوئی دیوار' کہ جس میں کوئی اینٹ کسی دوسری اینٹ سے الگ ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ (8:16) یاد رکھو' آج اگر کوئی شخص اس میدان سے پیٹھ دکھا کر' پیچھے کی طرف لوٹا' سوائے اس کے کہ وہ پینترا بدلنے کے لیے ایسا کرے یا اپنی جماعت میں ملنے کے لیے ایسا کرے' یعنی فوج کی تکنیک کے اعتبار سے ایسا کرے' تو وہ تو بات نہیں ہے کہ میدان کو چھوڑ دے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص آج پیٹھ دکھا کر بھاگا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ (8:16) خدا کا غضب اس پر وارد ہو جائے گا۔ وَ مَاْوٰهُ جَهَنَّمُ (8:16) اور وہ سیدھا جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

جنگ بدر کے دوران نبی اکرم کی موجودگی میں صحابہ کرامؓ جیسی سیسہ پلائی ہوئی منعم علیہ جماعت کو خالق کائنات کی طرف سے ایک تاریخی وارننگ

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ حق و باطل کی آویزش اور کشمکش اس قوم کے ایمان کا کتنا بڑا Test (امتحان) ہوتی ہے۔ اس کے لیے مثال وہ دی کہ جہاں اس کا وقوع ہی ناممکنات میں سے تھا لیکن کہا یہ کہ عام مومنین اور تم تو ایک طرف رہے' یہاں صحابہ کی جماعت ہے' میدانِ جنگ ہے اور نبی اکرم ﷺ قائد ہیں۔ اس وقت بھی یہ کہا کہ یاد رکھو! آج اگر تم میں سے کوئی شخص بھی پیٹھ دکھا کر' اس میدان سے بھاگا' تو اللہ کا غضب اس کے اوپر وارد ہو جائے گا اور وہ سیدھا جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ یہاں پہلی آیت میں جسے منعم علیہ بتایا تھا دکھا دیا کہ وہ قوم کون سی تھی اور دوسری میں جسے مغضوب علیہ بتا دیا' وہ قوم کون سی ہوتی ہے۔

پچھلے درس میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ منعم علیہ قوم یا جماعت کی علامت یہ ہوتی ہے کہ فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ (3:103) ان میں محبت اور مودّت اس قدر گہری اور شدید ہوتی ہے کہ ان کے جسم ہی نہیں' ان کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا (3:103) خدا کی نعمت ہے کہ جس کی بنا پہ وہ بھائی بھائی بن گئے۔ دوسری طرف یہ کہا کہ یاد رکھو! وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا (4:93) جس شخص نے کسی دوسرے مومن کو بالارادہ قتل کر دیا' کسی ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو بالارادہ قتل کر دیا' تو فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ خَالِدًا فِیْھَا (4:93) اس کی سزا جہنم ہے' جس میں وہ رہے گا وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ (4:93) اور خدا کا غضب اس پہ نازل ہو جائے گا۔ وَ لَعَنَہٗ (4:93) اور وہ اس کی تمام نوازشات سے محروم ہو جائے گا۔ وَ اَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا (4:93) اور وہ سخت ترین عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ ایک مسلمان اگر بالارادہ دوسرے مسلمان کو قتل کرتا ہے' باقی الفاظ کو چھوڑ دیجیے' اسی کو دیکھیے کہ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ (4:93) اس پر خدا کا غضب نازل ہو جاتا ہے' وہ قوم مغضوب علیہ ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ منعم علیہ وہ قوم تھی' جن کے دل باہم جڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی تھے اور اگر کسی ایک مومن کو بھی کسی دوسرے نے بالارادہ قتل کر دیا تو وہ قوم مغضوب علیہ ہو جاتی ہے' اس کے اوپر اللہ کا غضب نازل ہو جاتا ہے' پھر اس کا مسکن جہنم ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کی شہادت کے باوجود صحابہ کرامؓ کے سلسلہ میں جنگ جمل اور جنگ صفین کے متعلق ہماری تاریخ کا کردار

عزیزانِ من! اگر آپ اجازت دیں تو اس مقام پہ میں بتاؤں کہ ہماری تاریخ نے ہمارے ساتھ کیا غضب کر رکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری صدرِ اوّل کی تاریخ [1]' یعنی عہدِ رسالت مآب اور عہدِ صحابہؓ کی تاریخ (610-661AD)' قریباً اڑھائی سو سال بعد' بغیر کسی Previous written (سابقہ تحریری) ریکارڈ کے مرتب ہوئی اور جنہوں نے مرتب کی' میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس تاریخ کی بے شمار مثالیں میں نے پیش کی ہوئی ہیں لیکن اس تاریخ کی ایک مثال میں پھر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہاں کہا یہ گیا ہے کہ کسی ایک مومن نے کسی ایک دوسرے مومن کو ارادۃً قتل کر دیا تو اس پر خدا کا غضب نازل ہوگا' وہ جہنم میں جائے گا'

---

[1] 610-661ء جس میں عہدِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم 610-632AD' (23 سالہ دورِ نبوت) جس میں 610-622AD صدر اول اور 622-632 عہدِ رسالت مآب، 632-661AD عہدِ صحابہ کرامؓ یعنی 632-634ء حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دور' 634-645ء حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور' 645-656AD ء کا عہد حضرت عثمان غنیؓ اور 656-661AD ء کا حضرت علیؓ کا دورِ مبارک شامل ہے۔

اس کے اوپر لعنت ہوگی' عذابِ عظیم ہوگا۔ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک مومن کے بالارادہ قتل پر اتنا کچھ کہا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ ہماری تاریخ ہمیں کیا بتاتی ہے؟ عام مومن نہیں' بلکہ صحابہ کبار کی جماعت کے متعلق قرآن کی شہادت یہ ہے کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ (5:119) وہ اللہ سے راضی ہو گئے' اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ان کے متعلق بالفاظ صریح قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان کے لیے جنت انتظار کر رہی ہے' ان کے لیے بشارتیں ہیں۔ان کے لیے' جنہیں محمد رسول اللہ والذین معہ کہہ کر پکارا ہے' خدا کی طرف سے یہ کہا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ (148:29) یہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت محبت وسلوک رکھنے والے ہیں اور دشمن کے مقابلے میں ایک سخت چٹان کی حیثیت رکھنے والے اور رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ (148:29) یہ صحابہ کبار پورے کے پورے بھائی بھائی ہیں' ایک دوسرے کے دل ملے ہوئے ہیں۔

حضرت علیؓ، حضرت عائشہ صدیقہ اور پھر حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ کے مابین جنگ میں 10 ہزار اور 70 ہزار صحابہ کی شہادت معاذ اللہ!

اب آپ انہیں ہماری اس تاریخ کی رو سے دیکھیے۔ان کی یہ تاریخ ہمارے سامنے کس قدر غلط پیش کی گئی ہے۔یہ تاریخ بتاتی ہے کہ صحابہ کی یہ پوری جماعت' حضرت عثمانؓ کی شہادت (661AD) کے بعد' یہ پورے صحابہ' دو گروہوں میں بٹ گئے۔ایک گروہ کی قیادت حضرت عائشۃ الصدیقہؓ کر رہی تھیں۔ دوسرے گروہ کی قیادت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کر رہے تھے۔سارے صحابہ ان دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔یہ دونوں گروہ میدانِ جنگ کے اندر آپس میں جنگ وجدال میں مصروف ہوئے۔وہ کہتے ہیں کہ اس ایک جنگ کے اندر دس ہزار کے قریب صحابہ شہید ہوئے' استغفر اللہ' اور اس سے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر جو اگلی جنگ صفین ہوئی' اس میں ایک طرف حضرت علیؓ اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ تھے۔اس میں بھی دونوں طرف سارے صحابہ ہی تھے۔ان کی کیفیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں تاریخ بتا رہی ہے کہ میدان جنگ میں ہماری فوج کے ستر ہزار سے بھی زیادہ افراد شہید ہوئے۔ معاذ اللہ! سوچیے' عزیزانِ من! جب یہ تاریخ ہم دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہم سے پوچھتے ہیں کہ یہی تھا وہ درختِ طیب جو نبی اکرم ﷺ نے لگایا تھا اور اس کے یہی تھے پھل' کہ قرآن ایک مومن کے بالارادہ قتل کے متعلق یہ کہتا ہے اور یہاں کیفیت یہ ہے کہ یہ سارے مومنین ایک دوسرے کے مقابل میں کھڑے ہیں' ایک جنگ میں دس ہزار ایک دوسرے کے ہاتھوں سے مارا جاتا ہے' دوسری جنگ میں ستر ہزار ایک دوسرے کے ہاتھوں سے قتل کیا جاتا ہے اور سارا بالارادہ ہے۔معاذ اللہ' معاذ اللہ۔عزیزانِ من! یہ ہے وہ تاریخ جس کی رو سے میں انکار کرتا ہوں کہ یہ بہت بڑی سازش ہے جو ہمارے خلاف کی گئی ہے۔بہرحال یہ تو ایک ضمنی نکتہ تھا۔میں کہہ یہ رہا تھا

کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی مومن دوسرے مومن کو بالارادہ قتل کردے تو خدا کا غضب اس کے اوپر نازل ہوجاتا ہے۔

قرآن حکیم کے مکمل ضابطہ حیات کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے آئین کا نفاذ بغاوت ہوگی

قرآنِ کریم کی ایک اور حقیقت بھی بڑی ہی جامع اور عبرت آموز ہے۔ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور مکمل ضابطہ حیات ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اسے پورے کا پورا اختیار کیا جائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ اس میں سے کچھ حصہ ہم اختیار کرلیں اور دوسرے حصے کو چھوڑ دیں یا اس کی جگہ اپنے بنائے ہوئے قوانین یا دوسروں سے مانگے قوانین شامل کرلیں۔ یہ روش ایمان کی روش نہیں ہے' یہ شرک کی روش ہے۔ اسلام کو اختیار کرنا ہے تو کافتہ پورے کا پورا ضابطہ' اختیار کرنا ہوگا۔ کبھی آپ نے یہ سنا ہے کہ کسی مملکت میں رہتے ہوئے کوئی شخص اس مملکت کے آئین کے ایک حصے کو تو مانے اور دوسرے حصے سے انکار کردے۔ کیا آپ اُسے اس مملکت کا وفادار شہری تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں گے؟ وہ تو مملکت کا غدار کہلائے گا' باغی کہلائے گا۔ جرم اور چیز ہے' لغزش اور چیز ہے' خطا اور چیز ہے لیکن کسی مملکت کے آئین کے کسی حصے سے اس کی ایک شق سے بھی' انکار کرنا کہ میں اسے نہیں مانتا' میں اس کی جگہ دوسری مملکت کا جو آئین ہے' اس کی شق یہاں رکھنا چاہتا ہوں' بغاوت ہے۔ اسی کو قرآن شرک کہتا ہے۔

قرآن حکیم کے ضابطہ حیات کو مکمل طور پر تسلیم نہ کرنے کی ایک قرآنی مثال

عزیزانِ من! اس کی مثال سورۃ البقرۃ میں دیکھیے جہاں یہودیوں کا قصہ آیا ہے۔ وہاں قرآن نے بڑی عمدہ مثال دے کر کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ پہلے تو اپنے میں سے کمزور اور غریب لوگ' جو ذرا سا بے سہارا رہ جاتے ہیں' ان کو یہ اپنے گھروں سے نکال دیتے ہیں اور اس نکالنے کے بعد جب انہیں دوسری قوم کے افراد پکڑ کر لے جاتے ہیں اور غلام بناتے ہیں' تو پھر یہ باہمی مل کر چندہ اکٹھا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چلیے' ان کا کفارہ دے کر ان کو چھڑا لائیں اور کہتے یہ ہیں کہ قیدیوں کو چھڑانا بڑا ثواب کا کام ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ قیدیوں کو چھڑانا تو ثواب کا کام ہے اور وہ جو تم نے ان کو گھروں سے نکالا تھا' اس کے متعلق کیا خیال ہے؟ خدا کا قانون تو یہ ہے کہ جو اپنے ہیں' ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو۔ اگلی چیز یہ ہے کہ اگر کوئی اتفاق سے' کسی دوسرے کی گرفت میں آجائے تو اسے اس سے چھڑاؤ۔ دونوں چیزیں اکٹھی کرو۔ لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ جو قانون کا پہلا حصہ ہے' اس سے تو علی الرغم سرکشی برتتے ہو' ان کو گھروں سے نکالتے ہو' اور جہاں یہ لکھا ہے کہ قیدیوں کو چھڑانے سے ثواب ہوتا ہے' بھاگ کر اس کے متعلق آگے جاتے ہو۔ کہا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) کیا تمہاری یہ کیفیت ہے کہ تم خدا کے ضابطہ قانون کے ایک حصے کو تو مانتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔

قرآن حکیم کا آئین ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے

قطعی طور پر ذہن میں تو یہ آئے گا کہ ٹھیک ہے جی' اس سے انکار کرنے سے جو سزا ہے وہ تو ملنی چاہیے لیکن اس کا جو حصہ مانا ہے اس کی تو جزا' اس کا تو بدلہ' ملنا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم نے یہ سمجھا ہی نہیں ہے کہ آئین یا قانون ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Unit) ہوتا ہے۔ آپ کسی طبیب سے کوئی نسخہ (Prescription) لیجیے اور اس میں سے اس نسخے کے کچھ اجزا تو وہ رکھیے جو اس طبیب نے لکھے ہیں اور کچھ اجزا دوسرے کسی اور کے ہاں سے' مثلاً ایلوپیتھک ڈاکٹر کے ہاں سے' وید کے ہاں سے' لے کر شامل کر دیجیے اور پھر یہ دونوں ملا کر اس نسخے کو پی لیجیے اور پھر دیکھیے کہ آپ کا حشر کیا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہے تمہاری روش ۔اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو' دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ فما جزاء مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (2:85) جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا' یاد رکھو! اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی وہ ذلیل اور خوار ہوگا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) اور قیامت کے دن اس سے زیادہ شدید عذاب کے اندر وہ گرفتار ہوگا۔ یہ جو ثنویت (Dualism) ہے' قرآنِ کریم نے اسے شرک کہہ کر پکارا ہے اور اسی لیے اس نے یہ کہا ہے کہ وَ مَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ھُمْ مُّشْرِکُوْنَ (12:106) اکثر لوگوں کی کیفیت تم یہ دیکھو گے کہ وہ مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔

کسی مغضوب علیہ قوم سے کسی قسم کی مصالحت کرنا خود کو مغضوب علیہ بنانا ہے

قرآنِ کریم نے ''غضب'' کے لیے ایک اور لفظ بھی اپنے ہاں استعمال کیا ہے۔ وہ ہے ''سخط''۔ اس کا مادہ ''س خ [1] ط'' ہے۔ قرآنِ کریم نے سخط اللہ (5:80) کہا ہے کہ یہ لوگ جو خدا کے اس قانون کا کچھ حصہ تو تسلیم کرتے ہیں اور وہ لوگ جو خدا کے اس قانون سے متنفر ہوتے ہیں' اس سے منکر ہوتے ہیں ان سے یہ کہتے ہیں کہ سَنُطِیْعُکُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ [2] (47:26-47-26) کوئی بات نہیں ہم اسے بھی مانتے رہتے ہیں اور بعض امور میں ہم تمہاری بھی اطاعت کریں گے۔ ان کے ساتھ

---

[1] ناپسندیدگی' کراہت' ناراضمندی' غضب' غصہ' سخط علیہ وہ اس پر ناراض ہوا۔ سخط اس نے ناپسند کیا' کراہت کی۔ اسخطہ اس نے اسے ناراض کر دیا۔ صاحبِ تاج کے حوالے سے لغات القرآن' جلد سوم' ص 860 پر یہ معنی دیئے گئے ہیں۔ ماسخط اللہ کے معنی ہیں ''وہ امور جو قوانینِ خداوندی کے مطابق نہیں اور جن کا نتیجہ حبطِ اعمال ہے۔ (حوالہ لغات القرآن جلد سوم از پرویزؒ' ص 861)

[2] ہم بعض امور میں تمہاری اطاعت کریں گے۔

وہ اس قسم کا معاملہ اور سازشیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اس وقت تمہیں کیا بتائیں کہ ان کی حالت کیا ہوگی جب موت ان کے سامنے آ کھڑی ہوگی' اور ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج عذاب بن کر ان پر مسلط ہو جائیں گے اور ان کا کچومر نکال دیں گے (47:27)۔ یعنی جو خدا کے منکرین ہیں' ان کو جب اس دنیا سے لے جا رہے ہوں تو اس وقت جو ان کی کیفیت ہوگی وہ اس وجہ سے ہوگی کہ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰہَ وَ کَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ (47:28) انہوں نے ان کا اتباع کیا جن پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے۔ تو یہاں سے یہ نظر آیا کہ خود اس قسم کا جرم کرنا تو ایک طرف رہا' جو خدا کی مغضوب علیہ قوم ہو' اس کے ساتھ اس قسم کا Compromise (مصالحت) کرنا بھی' اس قوم کو خدا کا مغضوب علیہ بنا دیتا ہے۔

سوسائٹی کے اندر رزق کی مساویانہ تقسیم نہ رکھنے کے نتائج

اب آیئے اس میدان کی طرف' جو ویسے ہی پوری تاریخ انسانیت میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے اس دور میں تو اس نے بہت ہی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ یہ اکنامکس یا معاشیات کا دور ہے۔ پچھلے درس میں' میں نے عرض کیا تھا کہ ''منعم علیہ'' انہیں کہتے ہیں' جنہیں خدا کی نعمتیں میسر ہوں اور وہ خود تنہا اپنے لیے ان کو سمیٹ کر نہ رکھ لیں' بلکہ محتاجوں کو اور ان لوگوں کو جنہیں ان کی ضرورت ہے۔ آوازیں دے دے کر بلائیں' اور ان کے اندر شریک کریں۔ یہ تو رزق کی تقسیم کا طریق تھا۔ یہ تھا متوازن طریق یعنی پوری قوم کا پورا توازن برقرار رہے۔ یہ صورت نہ ہو کہ اس میں کوئی طبقہ تو ایسا ہے کہ جس کو اس قدر فراوانی سے یہ چیزیں حاصل ہیں اور دوسرا طبقہ ایسا ہے جو نانِ شبینہ تک سے بھی محتاج ہے۔ اس سے تو آپ نے دیکھا کہ توازن بگڑ جاتا ہے۔ اسے قرآن نے بڑے عجیب انداز میں کہا ہے۔ پچھلی دفعہ آپ نے یہ تو سن لیا تھا کہ خدا نے کہا تھا کہ اس کا غضب خوف اور بھوک کی شکل میں نازل ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور چیز کہی ہے کہ وَ کَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَۃٍۢ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَھَا (28:58) بہت سی قومیں مفلسی اور غریبی کی وجہ سے تباہ نہیں ہوئیں بلکہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے تباہ ہو گئیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس فراوانی میں انہوں نے کیا کیا' جس کی وجہ سے وہ تباہ ہو گئیں؟ سنیئے' عزیزانِ من! کیا الفاظ ہیں! کہا کہ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ (20:81) خدا کے عطا کردہ رزق کو حلال اور طیب طریق سے کھاؤ۔ حلال اور طیب طریق کی تشریح آگے کر دی کہ وَ لَا تَطْغَوْا فِیْہِ (20:81) ایسا طریق اختیار نہ کرو جس سے تقسیم رزق غیر متوازن ہو جائے۔ وَ لَا تَطْغَوْا فِیْہِ (20:81) کا یہ مفہوم سورۃ الرحمٰن کی اس آیت سے واضح ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ (155:8) تم ترازو میں' میزان میں' عدمِ توازن نہ پیدا ہونے دو۔ رزق کی تقسیم میں ڈنڈی نہ مارو' ترازو میں عدم توازن نہ پیدا ہونے دو۔ کیا الفاظ ہیں 'عزیزانِ من! اگر ایسا کرو گے تو کیا ہوگا؟ فَیَحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبِیْ (20:81) ہمارا غضب تم پر نازل ہو جائے گا وَ مَنْ یَّحْلِلْ عَلَیْہِ

غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰی (20:81) اور جس پر ہمارا غضب نازل ہو جائے' وہ قوم پست سے پست تر درجے کے اندر چلی جاتی ہے' پستیوں کی انتہا تک پہنچ جاتی ہے۔ تو یہ غضب کس وجہ سے نازل ہوا؟ کہ رزق کی فراوانی تو تھی لیکن تقسیم رزق میں توازن نہیں برقرار رکھا گیا تھا اور راستہ تو' ہم نے کہا' کہ دیکھا تھا۔ یہ صراطِ مستقیم سیدھا ہی نہیں' متوازن راستہ بھی ہے۔ راستے کا توازن اور نعماء کی تقسیم' اس انداز سے کی جائے کہ معاشرے کا توازن نہ بگڑنے پائے۔ اس کے اندر طبقات نہ ہونے پائیں' اس کے اندر اونچ نیچ نہ پیدا ہو۔ یہ عجیب الفاظ ہیں' اگر ایسا کرو گے تو ہمارا غضب تم پر نازل ہو جائے گا اور جن پر ہمارا غضب نازل ہوا کرتا ہے فَقَدْ هَوٰی (20:81) پھر وہ زندگی کی پست ترین سطح پر جا پہنچتے ہیں۔

"مغضوب علیہ" کے بعد لفظ "الضالین" کا مفہوم قرآن حکیم کی روشنی میں

اب آگے بڑھیے۔ اتنا ہی نہیں کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے تو یاد کرو' بلکہ یہ کہا کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ (60:13) اے جماعت مومنین! تم ان لوگوں کو اپنا دوست مت بناؤ جو غضبِ خداوندی کے معتوب ہیں۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ جب ایک عبد مومن اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہے کہ میں کہیں ان لوگوں کے راستے پر گامزن نہ ہو جاؤں' جو مغضوب علیہ ہیں' تو اس سے اس کا مقصود کیا ہوتا ہے اور قرآنِ کریم کا اس باب میں منشا کیا ہے؟ اتنا ٹکڑا واضح ہو گیا۔ اب دو قسم کے لوگ تھے جن کے متعلق کہا گیا تھا کہ ہم ان کی روش کے اوپر نہیں چلنا چاہتے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی غلطی سے' سہو سے' التباس سے' ابہام سے' کہیں ان کے راستے کے اوپر گامزن ہو جائیں۔ ایک تو تھے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (1:7) اور دوسرے تھے وَ لَا الضَّآلِّیْنَ (1:7)۔ جس طرح قرآنِ کریم "منعم علیہ" کے مقابلے میں "مغضوب علیہ" لایا ہے' اسی طرح اس نے ہدایت کے مقابلے میں "ضلالت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ترجمہ تو اس "ضلالت" کے لفظ کا ہمارے ہاں عام طور پر "گمراہ" کرتے ہیں لیکن اس کے معنی اس سے کہیں زیادہ وسیع بھی ہیں اور عمیق بھی۔ اس کے معنی ہیں' "حیران و پریشان ہونا' سرگرداں پھرنا یا کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہو جانا یا مختلف چیزوں کا اس طرح مل جانا کہ پھر انہیں الگ الگ نہ کیا جا سکے' جس طرح دودھ میں پانی مل جاتا ہے"۔ چونکہ صحرا میں راستہ کھو دینے والا اپنی تمام تگ وتاز کے باوجود منزل تک نہیں پہنچ سکتا اس لیے محنت اور کوشش کے ناکام رہ جانے اور رائیگاں چلے جانے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے قرآن میں ضَلَّ سَعْیُهُمْ (18:104) آیا ہے کہ ان کی تمام کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔ غلط راستے پر چلنے والا یا وہ کہ جس کو صحیح راستہ نہیں ملا' وہ اپنی پریشانی میں کبھی اس راستے کو صحیح سمجھتا ہے' کبھی اس راستے کو صحیح سمجھتا ہے' تو اس طرح ہر غلط راستہ اس کو دھوکا دے دیتا ہے۔ وہ غلط راستے کو بھی صحیح سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح سے حیران اور پریشان ہونے والا' سراب کو پانی سمجھ لینے والا' عربوں کے ہاں سراب کو "الْمُضِلّ" کہا جاتا تھا' گمراہ کرنے والا نہیں' بلکہ اس طرح اپنے آپ کو دکھانے والا کہ جیسا حقیقت میں وہ نہیں ہے' اور اس

لیے وہ یوں دیکھنے والا Confuse حیران ہو جاتا ہے' Confusion (ابہام' التباس) کے معنی میں یہ چیز آتی ہے۔ یعنی کسی معاملے کے اندر Confuse ہو جانا اور راستے کی تلاش میں سرگرداں پھرنا بڑی چیز یہ ہوتی ہے۔

نبی اکرمؐ کی سیرت کے سلسلہ میں مروجہ تراجم کے برعکس لفظ ''ضالاً'' کا پیش کردہ قرآنی مفہوم

مغضوب علیہ تو وہ ہیں جن کے سامنے راستے تو دونوں آ گئے تھے' صحیح بھی اور غلط بھی' اور انہوں نے غلط راستے کو چنا اور اس کے اوپر دانستہ چلے اور تباہ و برباد ہو گئے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں کہ جن کے سامنے راستہ ہوتا نہیں لیکن حقیقت کی تلاش کی تڑپ ان کے دل میں ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح حقیقت مل جائے۔ یہ جو راستے کی تلاش میں اس طرح حیران اور سرگرداں پھرنا ہے، اسے بھی ''ضالاً'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی (93:7)۔ عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے معاذ اللہ' کہ ہم نے تمہیں گمراہ پایا اور سیدھی راہ دکھائی۔ اس میں شبہ نہیں کہ نبی نبوت ملنے سے پیشتر اسی معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے لیکن اس میں ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ اسے از خود خدا کی طرف سے ابھی وحی نہیں ملی ہوتی۔ وہ اس معاشرے میں ہوتے ہوئے بھی ان میں کا نہیں ہوتا۔ وہ ان باتوں سے' جو معاشرے میں عام ہو رہی ہوتی ہیں' مطمئن نہیں ہوتا۔ لیکن جو چیز اطمینان دینے والی ہے' وہ اسے نظر نہیں آتی' وہ اسے ملتی بھی نہیں ہے۔ اب اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جو حاضر و موجود ہے' اس سے اطمینان نہیں' اور جو چیز باعث اطمینان ہے' وہ موجود نہیں' وہ سامنے نہیں' وہ ملتی بھی نہیں۔ اس کے قلب کی کیفیت اضطرابی ہوتی ہے کہ اس موجود سے عدمِ اطمینان ہے اور جو اطمینان بخش چیز ہے' اس کی تلاش میں وہ حیران اور سرگرداں ہے۔ عزیزانِ من! نبی کی یہ کیفیت باقی معاشرے سے مختلف ہوتی ہے۔ باقی معاشرہ ان غلط راستوں کے اوپر' جن پہ وہ چل رہا ہوتا ہے' مطمئن ہوتا ہے۔ وہ انہیں صحیح سمجھ کر' ان پر چل رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نبی ان راستوں کو غلط سمجھتا ہے لیکن صحیح کونسا ہے' اس کا اسے علم نہیں ہوتا۔ یہ علم اسے وحی کے ذریعے ملتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے متعلق جو کہا گیا کہ وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی (93:7) ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا' تیرے سینے میں حقیقت کی تلاش کی تڑپ تھی' ایک اضطراب تھا کہ تمہیں صحیح راستہ ملے' اس تڑپ اور تلاش کا نتیجہ تھا کہ ہم نے تمہیں صحیح راستہ دکھا دیا۔

صحیح منزل کے حصول کے لیے معاشرہ کی غلط روش سے بیزاری کا اظہار پہلی شرط ہے

عزیزانِ من! صحیح راستہ تک پہنچنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ معاشرے میں جو غلط چیزیں موجود ہیں' اُن سے اسے عدمِ اطمینان ہو۔ جب ان سے عدمِ اطمینان ہو گا تو پھر آپ کے دل میں صحیح راستے کی تلاش کے لیے تڑپ پیدا ہو گی اور وہاں آپ کو ہدایت ملے گی

اور اگر آپ اس پر مطمئن ہیں جو کچھ ہو رہا ہے تو اس کے بعد اس کا سوال ہی نہیں کہ آپ اسے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر چلے چلیں۔ تقلید ❶ میں ہوتا یہی ہے کہ جو کچھ معاشرے میں ہو رہا ہوتا ہے یا جو اسلاف سے چلا آ رہا ہوتا ہے، وہ اس سے مطمئن ہوتے ہیں، وہ اس پر غور و فکر ہی نہیں کرتے۔ غور و فکر وہ کرتا ہے جسے اس پر اطمینان نہ ہو جو کچھ ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں کا ایک بہت بڑا فلاسفر ❷ ہے۔ ابھی حال ہی میں گزرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے دور کے مروّجہ معتقدات و نظریات کو علیٰ ہٰذہٖ تسلیم کر کے، ان پر جم کر بیٹھنے رہنا، بت پرستی کہلاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خود عربوں کے ہاں بھی بت پرستی میں یہ مفہوم مضمر تھا۔ ان کی زبان میں بت کے لیے ''وثن'' ❸ کا لفظ استعمال ہوتا تھا اور ''وثن'' کے معنی ہیں ''غیر متحرک اور جامد''۔ اسی کو تقلید یا جمود کہا جاتا ہے۔ اس روش کا پیروکار کبھی صحیح راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ وہ جس راستے پر ہے، اسے وہ صحیح سمجھتا ہے، اس کو پرکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور اسی پہ وہ چلا جاتا ہے۔ یہ جو تقلید ہے ❶ وہ انسان کو کبھی صحیح راستے کی طرف آنے ہی نہیں دیتی۔ اس میں پہلی چیز تو یہ ہوتی ہے کہ اس سے انسان سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے اور یہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق کہا کہ ان کی روش بتا رہی ہوتی ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔

تقلید پرستی کا دوسرا نام جہنم ہے

قرآنِ کریم میں ہے کہ وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (7:179) تم شہری آبادیوں اور صحرا نوردوں میں اکثریت ان لوگوں کی دیکھو گے جن کی روش بتا رہی ہوتی ہے کہ یہ اہل جہنم ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کی وہ کون سی روش ہے، جو یہ بتا رہی ہوتی ہے؟ اس کے لیے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے، سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا (7:179) ماتھے میں آنکھیں بھی رکھتے ہیں، ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (7:179) کان بھی ان کے ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ

---

❶ Society divinised

❷ Erich Fromm (1900-1980)

❸ وثن بالمکان وہ کسی جگہ قیام پذیر ہو گیا۔ الواثن مقیم اور جما ہوا، جو حرکت نہ کرے۔ اسی سے وثن بت کو کہتے ہیں جو حرکت نہیں کر سکتا۔ (تاج و راغب) اس کی جمع اوثان (29:17) ہے) تاج نیز صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ وثن چھوٹے صنم (بت) کو کہتے ہیں۔ اس بنیادی مفہوم کی رو سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ ذہنی جمود کہ جسے تقلید کہتے ہیں، بدترین قسم کا وثن ہے جس کی پرستش ہر مردہ قوم میں ہوتی رہتی ہے..... اگر نظام کسی ایک مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے، تو یہ ''وثنیت'' ہو گی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن میں ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ (لغات القرآن، جلد چہارم از پرویزؒ۔ ص 1685)

کَالْاَنْعَامِ (7:179) یہ لوگ انسان نہیں' یہ حیوان ہوتے ہیں۔ پھر کہا کہ نہیں' حیوان بھی نہیں بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (7:179) حیوانوں سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ (7:179) اس لیے کہ یہ غفلت برتتے ہیں۔ان کے دل میں کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی' حقیقت تک پہنچنے کے لیے کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو اس کے دل میں پیدا ہوگا جو سمجھ' سوچ' سماعت' بصارت' قلب سے کام لے گا۔ یہ وہ ہے جو غفلت کے پردے پھاڑ کر حقیقت کی تلاش میں نکلے گا' اور جو اس طرح تلاش میں نکلے گا' یاد رکھیے! پھر وہ ہے جو صحیح راستے پہ جائے گا' ورنہ جو اس قسم کے لوگ ہیں ان کے متعلق نبی اکرم ﷺ کو کہا گیا کہ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (27:80) جو مردے ہیں' تم انہیں نہیں سنا سکتے ہو۔ وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ (27:80) بہرے کو کیا سنا سکتے ہو۔ بہرہ بھی کچھ اشاروں سے سمجھ سکتا ہے' کوئی تھوڑی بہت توجہ دے گا تو کچھ نہ کچھ پلے پڑ جائے گا۔ وہ بات کرنا چاہیں تو بہرہ منہ موڑ کے چل دے' وہ بہرہ کیا سن سکے گا؟ وَ مَآ اَنْتَ بِھٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِھِمْ (27:81) یہ جو ان کی ضلالت ہے' اس سے اندھوں کو نہیں نکال سکتے۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ڈاکٹر سید عبدالودود)

فریبِ مغربی جمہوریت

اور اس فریب سے بچ نکلنے کا راستہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقاً وَعَدْلاً لاَّ مُبَدِّلِ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ O وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِيْ الأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيْلِ اللّهِ إِن يَتَّبِعُوْنَ إِلاَّ الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلاَّ يَخْرُصُوْنَ O (سورہ الانعام 116-115)۔

''اس قرآن میں خدا کا ضابطہ قوانین تمام صداقتوں کو اپنے اندر لئے اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہو چکا ہے اب ان قوانین خداوندی میں کوئی تغیر و تبدل کرنے والا نہیں۔ یعنی یہ مکمل ایسا ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں اور محکم ایسا کہ اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ اس خدا کا ضابطہ قوانین ہے جو سب کچھ سنتا اور ہر بات کا علم رکھتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ ضابطہ خداوندی اس روش کے خلاف دعوت دیتا ہے جس پر نوع انسان کی اکثریت گامزن ہے تو یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا اس لئے کہ کسی مسلک کے صحیح ہونے کی یہ کوئی دلیل نہیں کہ اسے اکثریت نے اختیار کر رکھا ہے۔ اگر تم (اس خیال کے مطابق) لوگوں کی اکثریت کی اتباع شروع کر دو تو یہ چیز تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر گمراہ کر دے گی۔ دنیا کی اکثریت کا تو یہ عالم ہے کہ لوگ محض ظن و تخمین کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور یقینی علم کی بجائے قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہیں (اس کے برعکس خدا کی وحی جو پیش کرتی ہے وہ سرتاسر علم و حقیقت پر مبنی ہوتا ہے)''۔

جب سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے، اس وقت سے لے کر آج تک پاکستانی قوم انتشار اور پریشانی میں مبتلا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لئے جو نصب العین منتخب کیا تھا اور جس کی خاطر تحریک آزادی کی لڑائی لڑی تھی اور جس کے نتیجے میں مملکت پاکستان قائم ہوئی تھی وہ اس مملکت میں قرآنی نظام کا قیام تھا لیکن اب قوم کو ایک عجب مشکل درپیش ہے۔ ایسی مشکل جس کا شاید کسی دوسری قوم کو سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مشکل یہ ہے کہ **نصب العین تو موجود ہے لیکن عوام کے سامنے اس کے صحیح خط و خال موجود نہیں اور اس سے بھی بدتر مشکل یہ ہے کہ اس نصب العین تک پہنچنے کا عوام اور خواص دونوں کو راستہ معلوم نہیں۔** قرآنی نظام تک پہنچنے کی خواہش کے باوجود جو راستہ سب نے متفقہ طور پر اختیار کر رکھا ہے وہ مغربی جمہوریت کا راستہ ہے۔ چنانچہ اب کیفیت یہ ہے کہ اندھوں کی ایک قطار ہے جس میں عوام اور دانشور سبھی شامل ہیں۔ ایک کے پیچھے دوسرا اندھا۔

دوسرے کے پیچھے تیسرا ہر خطرے سے بے نیاز رواں دواں چلے جا رہے ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کون سے کنویں میں کس وقت جا گریں۔ ان اندھوں میں سب سے نمایاں اور قد آور اخبار نویس ہیں جن کی جمہوریت کی پکار وحدت ملت کو پارہ پارہ کر کے ہر وقت انتشار کی مشینری کو حرکت میں رکھتی ہے۔

قرن اول کے بعد مسلم ممالک میں صدیوں تک ملوکیت کا دور رہا ہے اور چونکہ شخصی حکومتیں استبداد کا مجسمہ ہوتی ہیں اس لئے یہی صورت ان ممالک میں رہی اور جب یورپ نے اپنے ہاں جمہوریت کو رواج دیا تو چونکہ یہ نظام شخصی حکومتوں کے مقابلے میں بہتر تھا اس لئے دنیا میں ہر طرف اس کا خیر مقدم کیا گیا اور چونکہ اسلامی نظام اس عرصے میں نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا اس لئے دنیا بھر کے مسلمان بھی اس کے ہم نوا ہو گئے۔ جب قومیں زوال پذیر ہو جاتی ہیں تو ان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو ترقی پسند ظاہر کرنے کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ اسلام جمہوری نظام حکومت سکھاتا ہے۔ حالانکہ مغرب کا جمہوری نظام قرآن کے جمہوری نظام سے بالکل مختلف شے ہے۔ آج کچھ لوگ ایسے ہیں جو مغربیت کو اپنانے میں اپنی برتری تصور کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو غیر شعوری طور پر اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں اور عوام کی اکثریت ان میں شامل ہے۔ ایک تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ہر وقت مغربیت سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کی خود غرضی اور نفس پرستی کی انتہا یہ ہے کہ مغربی جمہوریت کے شور میں ان کی آواز سب سے اونچی اور عملی طور پر وہ اس راستے میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ یہ گروہ ان لوگوں کا ہے جن کے لئے علماء کی غلط العام اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ مغربی جمہوریت کے متعلق جو سوال ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) کیا مغرب کا جمہوری نظام قرآنی نظام کے مطابق ہے یا متصادم؟

(۲) کیا مغربی جمہوریت کے راستے پر چل کر ہم قرآنی نظام کے نصب العین کو حاصل کر سکتے ہیں؟

(۳) کیا اہل مغرب اپنے وضع کردہ جمہوری نظام سے خود مطمئن ہیں؟

قرآنی نظام

قرآنی نظام کے حصول کا جذبہ پاکستانی عوام میں شدت سے موجود ہے لیکن وہ خیر و شر کی قوتوں میں جو اس وقت پاکستان میں کارفرما ہیں فرق کرنے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ مغربی جمہوریت کے تند و تیز سیلاب میں لاشعوری طور پر بہے جا رہے ہیں۔ قرآنی نظام اور مغرب کے جمہوری نظام میں بنیادی فرق Sovereignty حاکمیت کا ہے۔ مغربی جمہوریت میں حاکمیت عوام کی تسلیم کی جاتی ہے (گو یہ نظریہ غلط اور خود فریبی پر مبنی ہے جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا) اور قرآنی نظام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ یوں تو پوری کائنات میں اللہ کی حاکمیت ہے۔ ہر ذرۂ کائنات اور اس کی ہر حرکت اللہ کے کنٹرول میں ہے لیکن جہاں تک انسانی معاملات کا تعلق ہے اللہ انہیں براہ

راست کنٹرول نہیں کرتا۔ انسان کے لئے راہنمائی انبیاء کے ذریعے نازل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی انسان کو اختیار و ارادہ دے دیا گیا ہے کہ چاہے اس راہنمائی کے مطابق زندگی بسر کرے یا نہ کرے۔ اگر کرے گا تو اس کی ذات کی تعمیر ہوتی جائے گی اور اگر نہ کرے گا تو اس کی ذات کی تخریب اور اس کے معاشرے میں فساد برپا ہوتا جائے گا۔ چنانچہ انسانی دنیا میں اللہ کی حاکمیت سے مراد اللہ کے قانون کی حاکمیت ہے اور اس وقت زمین پر اللہ کا نازل کیا ہوا قانون صرف قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اس لئے انسانی معاشرے میں اللہ کی حاکمیت سے مراد قرآن کے قوانین اور مستقل اقدار کی حاکمیت ہے اور چونکہ اللہ کے قوانین کی محکومیت انفرادی طور پر اختیار نہیں کی جاسکتی اس کے لئے انسانی مشینری کی ضرورت ہوتی ہے' ان معنوں میں قرآن اس ہیئتِ اجتماعیہ کو جو تمدنی نظم ونسق کو کتاب اللہ کے مطابق چلائے حاکم تسلیم کرتا ہے۔ جماعت مومنین اس صورت میں ہی کتاب اللہ کے مطابق نظم ونسق قائم کرسکتی ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ چنانچہ مومنین کے لئے تمکن فی الارض ضروری ہے' بالفاظ دیگر اسلامی مملکت میں حکومت کی مشینری صرف اللہ کے قوانین کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس مملکت میں روزمرہ کے معاملات زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے طے ہوتے ہیں اور ایسے جزوی قوانین مرتب کیے جاتے ہیں جو قوانین خداوندی کی حدود سے باہر نہیں جاسکتے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ اللہ کے قوانین کے دائرے سے باہر جائے اور دوسروں سے اپنے خودساختہ قوانین منوائے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُواْ عِبَاداً لِّيْ مِن دُونِ اللّهِ .....

(۳/۷۸)۔

(کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطہ قوانین حکومت اور نبوت (بھی کیوں نہ) عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہنا شروع کردے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو)۔

چنانچہ قرآنی نظام میں قوت کا سرچشمہ خارجی ہے۔

مغربی جمہوریت

اب دیکھئے کہ قرآن کے مقابلے میں مغربی جمہوریت کس قسم کا نظام پیش کرتی ہے۔ اقوام مغرب کے ہاں جمہوریت کی بنیاد حسب ذیل مفروضات پر ہے۔

(۱) اس نظام میں حاکم اور محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ ''عوام کی حکومت عوام کے مفاد کی خاطر اور عوام ہی کی وساطت سے'' کا اصول اس کی بنیاد ہے۔

(۲) عوام کا منشاء ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

(۳) کسی چیز کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار ان نمائندگان کی کثرت رائے سے ہوتا ہے۔

(۴) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے تسلیم کرنے پڑتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ ایک لمبی مدت تک آزمانے کے بعد خود

مغربی مفکرین کی مندرجہ بالا نظریات کے متعلق کیا رائے ہے۔ پروفیسر کوبن لکھتا ہے: ''اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے عملاً حکومت افراد کے ایک طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا افراد کے دوسرے طبقے کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی ابتدائی قبائلی زندگی سے آگے بڑھ جائے تو حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے'' (Crisis of Civilisation)۔

اس نظریے کے متعلق کہ صحیح وہ ہے جسے اکثریت صحیح کہہ دے: پروفیسر مذکور لکھتا ہے۔ ''اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہ صحیح ہو سکتا ہے جو دراصل صحیح ہو، نہ وہ جسے لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔''

اقتدارِ اعلیٰ کے متعلق پروفیسر کوبن لکھتا ہے: ''آج اس مفروضہ کو حقیقت ثابتہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ اقوام کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے اور اس کے بعد بحث صرف اس مسئلہ کے متعلق رہ جاتی ہے کہ اختیارات کسی فردِ واحد کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں یا کسی نمائندہ جماعت کے۔ لیکن ہمیں غور کرنا چاہئے کہ اقتدارِ اعلیٰ کا یہ تصور صحیح بھی ہے؟ یہ ہے اصل مسئلہ کہ آیا قانون کا سرچشمہ عوام ہی کا منشاء ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ بھی ہے؟ یعنی پروفیسر مذکور کے نزدیک سوال یہ نہیں کہ قانون کی تدوین کا حق کسی ایک فرد کو حاصل ہے یا نمائندہ اسمبلی کو، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا انسانوں کو یہ حق حاصل بھی ہے کہ بلا حدود و قیود قوانین وضع کر لیں؟ پروفیسر مذکور آگے جا کر لکھتا ہے کہ انسانوں کو یہ حق حاصل ہی نہیں۔ تمام قوانین اپنے اصل کے اعتبار سے پہلے ہی سے مدون شدہ ہیں۔ انسانوں نے فقط ان قوانین کو نافذ کرنا ہے۔ ان اصولی قوانین کا سرچشمہ پروفیسر مذکور کے نزدیک قانون فطرت ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک یہ بنیاد ہی غلط ہے جس پر جمہوریت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ حق حق ہوتا ہے خواہ اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اٹھے اور باطل، باطل ہوتا ہے خواہ اسے سو فی صد تائید حاصل ہو۔

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ایونگ (Ewing) اپنی کتاب The Individual, The State and World Goverment میں لکھتا ہے کہ نظام جمہورت کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ نظام باہمی رضامندی کے قریب تر چلا جاتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس میں مختلف مفادات کو نمائندگی حاصل ہوتی ہے اور جو سیاسی آزادی اس نظام کی رو سے حاصل ہوتی ہے اس کا اثر انسانی کریکٹر پر بہت اچھا پڑتا ہے۔ ان دلائل سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اس نظام کے بہت سے فائدے ہیں، لیکن دوسری طرف اس کے نقصانات اس کے فوائد سے بڑھ کر ہیں۔ جمہوریت کے خلاف سب سے بڑی اصولی دلیل اس قدر واضح ہے کہ اس کی لمبی چوڑی تشریح کی ضرورت نہیں۔

ڈیموکریسی کے معنی ایک ایسا نظام حکومت ہے جس میں ہر انسان دخیل ہوتا ہے لیکن حکومت ایک خاص فن ہے اور

بڑی مشکل سائنس۔ ہر شخص میں نہ اس کی صلاحیت ہوسکتی ہے نہ اس کا مذاق۔ نہ اس کے لئے فرصت نہ میلان کہ وہ اس فنی سائنس کا ادراک حاصل کر سکے۔ جس طرح ہر عطائی فن طب کا ماہر نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا جمہوریت کے معنی ہیں ایسے لوگوں کی حکومت جو فن حکومت کے ماہر نہ ہوں۔ بس اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے طب کے کسی عام سوال کے متعلق عوام کی کثرت رائے سے فیصلہ کیا جائے اور ان آراء میں ماہر فن ڈاکٹر کی رائے بھی ایک ہی شمار کی جائے۔

جمہوریت کے خلاف یہی اعتراض افلاطون نے کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ نظام حکومت جیسے فریضے کو عوام کے سپرد کرنا بڑی حماقت ہے۔ اسے ملک کے بہترین افراد کے سپرد کر دینا چاہئے تاکہ وہ اپنی دانش اور آراء سے عوام کی سطح بلند کرتے جائیں۔

اطالوی مدبر میزینی (Mazini) لکھتا ہے۔ ''اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے لیکن ایسی قوم میں جس میں وحدت عقائد نہ ہو جمہورت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے ہو سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (جیسا ملوکیت میں) یا زیادہ (جیسے جمہوریت میں) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدار اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی ایسی چیز باقی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے غلبہ سے محفوظ رکھے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابل تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو تو ہمارے پاس کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فلاں فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ اگر خدا درمیان میں نہ ہو تو ہر شخص اپنے زمانہ سطوت میں مستبد بن جاتا ہے۔ یاد رکھئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضے کی انجام دہی سے قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

(Interpretters of Man, pp. 46-47)

یہ جو اوپر بیان کیا گیا ہے یہ انیسویں صدی میں لکھا گیا تھا اور اب فرانس کا مفکر رینی گون Rene Guan لکھتا ہے۔ ''اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ کریں تو یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا وجود ناممکنات میں سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرنا ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی۔ حاکم اور محکوم کا وجود دو الگ الگ عناصر کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت و اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی

فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔

Irwing Barbit نامی مفکر Crisis of the Modern World میں لکھتا ہے: ''جمہوریت نظری اعتبار سے تو اپنے آپ کو مثالی نظام محسوس کرتی ہے لیکن عملی طور پر یہ ناممکن نظر یہ ہے''۔

H.J.Menkin اپنی کتاب Treatise on Right and Wrong میں لکھتا ہے: ''انسان کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ اپنے لیے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دور سے بھی اچھی حکومت کہا جائے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقع محیر العقول ہیں' اور بہت سی ایسی جو بڑی عبرت آموز تھیں۔ لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات ہے۔ فطری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ یہ افراد مملکت کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور پبلک کی خادم' لیکن درحقیقت اس کا عملی نقشہ جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حکومت کا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب ونہب ہوتا ہے۔ اس بناء پر مختلف اسالیب حکومت میں سب سے زیادہ ناکام نظام جمہوریت ہے۔ جمہوری نظام کے ارباب حل وعقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بناء معقولیت پر ہونی چاہئے لیکن ان کا جذبہ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈال سکے اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے وہ ان لوگوں کے توسط سے جو فی الحقیقت پبلک کے دشمن ہوتے ہیں' غیر مختتم عرصہ تک برسر اقتدار رہتے ہیں۔

یو۔این۔او کی تحقیقاتی کوشش

۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس UNESCO نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض کے لئے مقرر کی کہ وہ جمہوری انداز حکومت کے متعلق سرکاری طور پر چھان بین کرے۔ اس چھان بین کا نتیجہ انہوں نے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا جس کا نام ہے Democracy in the World of Tension اس نے دنیا بھر کے مفکرین اور مدبرین کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے؟ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا کہ یہ لفظ مبہم ہے اور آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا کیا جمہوریت کے خلاف ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف اگیٹیشن کرے اور اکثریت کے سابقہ فیصلے کو بدلوا ڈالے۔

جمہوریت ایک خودفریبی ہے

یہ ہے موجودہ دور کے مفکرین و مدبرین کی جمہوریت کے متعلق فکری کاوش کا ماحصل۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ نظری اعتبار سے جمہوریت کتنی خوش آئند معلوم ہوتی ہے لیکن عملی طور پر انسانیت کے مسائل حل کرنے میں کس قدر ناکام ہے۔ یہ کس قدر غلط نظریہ ہے کہ جمہوریت میں حاکم اور محکوم کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ حالانکہ ایک مغربی مفکر کے قول کے مطابق State is a conspiracy against the nation حکومت حاکم طبقہ کی محکوم طبقہ کے خلاف سازش کا نام ہے۔ غور کیجئے کہ بالفرض انتخابات کے وقت میں کسی ایک شخص کے حق میں ووٹ دیتا ہوں۔ اس ووٹ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص چند امیدواروں میں سے بہتر شخص ہے لیکن میرے اس فیصلے سے نہ تو وہ شخص حقیقتاً سب سے بہتر ہوتا ہے اور نہ ہی وہ شخص ہر معاملے میں میرے منشاء کی تعبیر کرسکتا ہے۔ اسمبلی میں وہ نمائندہ جب ایک مسئلہ پر رائے دیتا ہے تو ناممکن ہے کہ اس مسئلہ پر وہ ہر ووٹر کی رائے کی نمائندگی کر سکے۔ لہٰذا منتخب شدہ نمائندوں کے متعلق یہ کہنا کہ ہر مسئلہ میں ان کی رائے درحقیقت ان لوگوں کی رائے ہے جنہوں نے ان کے حق میں ووٹ دیا تھا خودفریبی کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ مغرب کے جمہوری نظام میں آخری فیصلے کا حق اکثریت کو حاصل ہوتا ہے۔ اس نظام میں نہ کوئی چیز مطلق حق ہے اور نہ مطلق باطل۔ **لیکن دوسری طرف قرآن حق اور باطل کے مستقل اور مطلق معیار مقرر کرتا ہے۔** جس چیز کو اس نے صحیح قرار دیا وہ ہمیشہ صحیح ہے۔ چاہے سو فی صد انسان اسے باطل قرار دے دیں۔ قرآن کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ حق اپنی ذات میں حق ہوتا ہے۔ اگر وہ لوگوں کے خیالات کا تابع ہو جائے تو کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔ مغربی جمہوریت کا نظریہ یہ ہے کہ حق اور باطل کے تعین میں اکثریت غلطی نہیں کرتی حالانکہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ نوع انسانی کی اکثریت عام طور پر صحیح راستے پر نہیں ہوتی اور قرآن اس تاریخی شہادت کی تائید کرتا ہے اور واضح الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ

إِنَّ كَثِيراً مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ

میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ انسانوں کی اکثریت کبھی حق پر اکٹھی ہو ہی نہیں سکتی بلکہ یہ کہ اگر حق پر اکٹھی بھی ہو جائے تو حق کو پرکھنے کا معیار یہ نہیں کہ چونکہ اکثریت اس پر جمع ہو گئی ہے اس لئے یہ حق ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ اس وقت بھی حق پر تھے جب ان کی تائید کرنے والا ابھی کوئی دوسرا شخص نہ تھا اور پوری کی پوری اکثریت مخالف تھی۔ اگر اسلام مغرب کے مفہوم کے اعتبار سے جمہوری نظام ہوتا تو حق وہی قرار پاتا جس کی تائید کفار مکہ کر رہے تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں قرآن کریم نے نوع انسانی کے لئے محکم اور غیر متبدل اصول مقرر کر دیے ہیں۔ یہ اصول اسلامی معاشرے کے تمام بنیادی خدوخال متعین کرتے ہیں۔ اس لئے ان اصولوں کے متعلق یہ تصور ہی غلط ہے کہ ان کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے رائے شماری کرائی جائے۔ چنانچہ اسلامی نظام کا یہ حصہ جمہوری تصورات سے یکسر الگ اور

بلند ہے۔ البتہ ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانے کی ملت اسلامیہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزوی قوانین خود مرتب کرے گی اور قوانین کی تنفیذ کے لیے ایک مشینری وضع کرے گی۔ یہ وہ پہلو ہے جس کے لئے قرآن مشاورت کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا اس حد تک اسلام ایک مشاورتی نظام ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام متبدل اور غیر متبدل Permanance and Change کا حسین امتزاج ہے۔ خود حضور اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ حضور ﷺ روزمرہ کے معاملات میں ہر اہم مرحلہ پر صحابہ کرامؓ سے مشاورت فرماتے تھے اور باہمی مشاورت سے جو طے پاتا تھا اس کے لئے احکام نافذ فرماتے تھے۔

اس وضاحت کے بعد اگلا مرحلہ یہ سامنے آتا ہے کہ پاکستانی قوم کی کشتی عرصہ نصف صدی سے جس بھنور میں پھنسی چلی آ رہی ہے اس سے باہر نکلنے کا راستہ صرف ''قرآنی نظام'' ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے لئے Guideline کیا ہے؟ یعنی وہ بنیادی اصول کیا ہیں جن پر قرآنی نظام کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے؟

قرآنی معاشرہ کے بنیادی اصول

آج مملکت پاکستان میں اکثر لوگ نالاں ہیں کہ نصف صدی کا عرصہ گذرنے کے بعد بھی یہاں اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکا حالانکہ حصول پاکستان کا نصب العین یہی تھا۔ دوسری طرف یہ بھی عام احساس ہے کہ درآمد شدہ غیر اسلامی نظریات اسلامی نظام کے قیام کے راستے میں حائل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غیر اسلامی جدید نظریات عوام اور خاص طور پر نئی پود کے ناپختہ ذہنوں کو پراگندہ کر رہے ہیں۔ لیکن اسلامی نظام کے قیام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہم خود اس نظریہ حیات سے غافل ہیں جو قرآن کریم نے ہمارے لئے متعین کیا ہے' ہم ان مستقل اقدار سے بے خبر ہیں جو قرآنی معاشرہ کی بنیاد ہیں۔ ہمارے علماء اور ہمارے وہ اخبارات' جو اسلامی نظام کے قیام کے خواہاں ہیں' وہ بھی مدت سے یہی ایک ہی راگ الاپتے چلے جا رہے ہیں کہ پاکستان میں قرآنی قوانین نافذ کئے جائیں۔ لیکن برادران! کوئی مملکت اپنے ہاں صرف قرآنی قوانین نافذ کرنے سے اسلامی مملکت نہیں بن جاتی۔ مثلاً اگر کوئی غیر مسلم حکومت اپنے ہاں اسلامی قوانین رائج کرے تو کیا وہ اسلامی حکومت بن جائے گی؟ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کی بنیاد پر معاشرہ متشکل کرے۔ **قوانین دراصل ان موانع کو دور کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں جو کسی مملکت کے حصول مقصد کے راستے میں حائل ہوں۔** قرآنی اقدار کے مطابق معاشرہ کی تشکیل اس صورت میں ممکن ہے کہ افراد معاشرہ کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ان اقدار کی عظمت و اہمیت ان کے دل و دماغ میں راسخ ہو جائے۔ وہ ان کا احترام و تحفظ اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں۔ یہی ان کے نزدیک صحیح اور غلط کا پیمانہ ہوں۔ ان کا ہر ارادہ ان کے مطابق اور ہر فیصلہ ان کے تابع ہو۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو

جائے کہ ان کا ہر قدم غیر شعوری طور بھی ان اقدار کے مطابق اٹھے۔

مستقل اقدار سے کیا مراد ہے؟ اسے میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں ایک ضرب المثل مشہور ہے: ''مال صدقہ جان۔ جان صدقہ آبرو''۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مال بھی اپنی جگہ قیمت رکھتا ہے لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک چیز بچ سکتی ہو تو انسان کو جان کی خاطر مال قربان کر دینا چاہئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مال کے مقابلے میں جان کا بچانا از روئے عقل زیادہ نفع رساں ہے اس لئے جب مال اور جان میں Tie پڑ جائے تو انسانی عقل مال کو قربان کر کے جان کو بچالے گی اور اگر کبھی ایسا ہو کہ جان اور آبرو میں Tie آ پڑے تو آبرو کے تحفظ کے لئے جان قربان کر دی جائے گی۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مال، جان اور آبرو میں ہر شے اپنی اپنی قیمت رکھتی ہے لیکن ایک تو ان کی قیمتوں میں فرق ہے یعنی مال کی قیمت سے جان کی قیمت زیادہ ہے اور جان کی قیمت سے آبرو کی قیمت زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ آبرو اتنی قیمتی چیز ہے کہ اسے کسی چیز کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظ دیگر مال اور جان کی اقدار اضافی یا Relative ہیں اور آبرو کی قیمت مستقل Permanent یا مطلق یعنی Absolute ہے۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ عقل کو بتایا جائے کہ زندگی کی فلاں متاع کی قیمت کیا ہے اور کون کون سی چیزیں ہیں جو مستقل اقدار رکھتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب تک مستقل اقدار کا تعین نہ کیا جائے یہ متعین کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ کس چیز کی خاطر کونسی چیز قربان کر دی جائے۔ دین وہ طریق زندگی بتاتا ہے جس پر چل کر کاروان انسانیت اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ دین یہ طریق کس طرح متعین کرتا ہے اس کا جواب ایک فقرے میں یہ ہے کہ دین مستقل اقدار کا تعین کرتا ہے۔ قرآن کریم نے ان اقدار کی الگ فہرست مرتب کر کے نہیں دی لیکن اس کی ساری تعلیم اس محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ کہیں یہ ابدی اصولوں کی شکل میں دی گئی ہیں۔ کہیں حضرات انبیاء کرامؑ اور جماعت مومنین کی صفات اور خصوصیات کے رنگ میں۔ علاوہ بریں ذات خداوندی ایک مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کی صفات بھی ان اقدار کا سرچشمہ ہیں۔ اسلامی مملکت میں یہ اقدار مملکت کے اجتماعی امور میں بھی کارفرما ہوں گی اور افراد کی سیرت میں بھی۔ یہ موضوع بہت وسیع ہے لیکن چند ایک مستقل اقدار کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں۔

اللہ پر ایمان

قرآن کی مستقل اقدار پر ایمان کا بنیادی ستون خود اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے۔ اللہ پر ایمان کوئی نظریاتی شے نہیں۔ اس کا تعلق انسان کے اعمال اور روزمرہ زندگی سے ہے۔ اللہ پر ایمان کے معنی ہیں اس کی ہستی پر یقین، اس کے قوانین پر پورا پورا اعتماد اور ان کی اطاعت کا اقرار، اور اس کے بعد اپنے ہر انفرادی فعل سے پہلے اللہ تعالیٰ کو حاظر ناظر جاننا اور ہر اجتماعی عمل میں اللہ کی حاکمیت Sovereignty کو تسلیم کرنا، یعنی یہ تسلیم کرنا کہ ہر

معاملہ میں فیصلے کا آخری حق اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے **لا الـٰـہ الا اللـــہ**' اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں' کوئی Sovereign نہیں۔ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) اختیارات و اقتدار کا واحد مالک اللہ ہے۔

قرآن ایک طرف کہتا ہے۔لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهِ أَحَداً (۲۶/ ۱۸)۔اللہ اپنی حاکمیت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا تو دوسری طرف انسانوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَداً (۱۱۰/ ۱۸) کوئی شخص اپنے رب کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔انسانی دنیا میں اللہ تعالیٰ اپنے احکام براہ راست نافذ نہیں کرتا بلکہ انسانوں کو یہ احکام وحی کے ذریعے ملتے ہیں جو انبیائے کرام پر نازل ہوتی ہے۔اللہ کی وحی اس وقت صرف اللہ کی آخری کتاب میں موجود ہے جو اللہ کے آخری نبی ﷺ پر نازل ہوئی۔چنانچہ کہا گیا أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِيْ حَكَماً وَهُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلاً (۶/۱۱۴) اے رسول! ان سے پوچھو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر کسی اور کے قانون کے مطابق تمہارے فیصلے کرنے لگ جاؤں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک مفصل کتاب' ایک واضح اور نکھرا ہوا ضابطہ قوانین' بھیج دیا ہے۔چنانچہ انسانی دنیا میں اللہ کی Sovereignty سے مراد قرآن کریم کی Sovereignty ہے یعنی ہر معاملے کے فیصلے کا آخری اختیار قرآن کے قوانین کو حاصل ہے۔

انسانی ذات پر یقین

یہ بھی ایک بنیادی چیز ہے جس پر باقی مستقل اقدار پر ایمان کا انحصار ہے۔انسان دو چیزوں پر مشتمل ہے: انسانی جسم اور انسانی ذات جسے قرآن نفس کے نام سے پکارتا ہے۔کائنات کی دیگر جاندار اشیاء کی طرح انسانی جسم میں بھی ہر وقت تعمیر و تحلیل Catabolism, Anabolism کا عمل جاری رہتا ہے۔ایک طرف خوراک سے جسم کی تعمیر ہوتی ہے تو دوسری طرف حرکت سے جسم تحلیل ہو کر بول و براز' پسینہ و کاربن ڈائی آکسائیڈ کی شکل میں خارج ہوتا رہتا ہے۔انسانی ذات میں بھی ہر وقت تعمیر و تخریب کا عمل جاری رہتا ہے۔ہمارے وہ اعمال جو قوانین خداوندی کے مطابق ہوں ان سے ہماری ذات کی تعمیر ہوتی ہے اور وہ اعمال جو قوانین خداوندی کے خلاف ہوں ان سے ذات کی تخریب ہوتی ہے۔وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا O فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا O قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا O وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا O (۱۰-۷/۹۱) انسانی ذات اور جس انداز سے اسے متوازن بنایا گیا ہے۔پھر اس کے اندر جس انداز سے اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ یہ چاہے تو (غلط روش پر چل کر) اپنے اندر انتشار پیدا کرے اور چاہے تو اس انتشار سے محفوظ رہ کر مستحکم سے مستحکم تر ہوتی چلی جائے۔(انفس و آفاق میں کارفرما یہ تمام پروگرام اس حقیقت پر شاہد ہے کہ) جس نے اپنی ذات کی نشو و نما کر لی وہ کامیاب و کامران ہو گیا' اسے زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔لیکن جس نے اسے مفاد پرستیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھا

اور ابھرنے نہ دیا اس کی کشت حیات ویران ہوگئی۔ اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ کی خوابیدہ رہ گئیں۔

انسانی ذات انسانی بچے کو Potential Form میں ملتی ہے اور اعمال صالحہ سے اس میں بتدریج پختگی آتی جاتی ہے۔ ہمارا جسم ہر آن تحلیل ہوتا رہتا ہے اور طبعی موت کے بعد یکدم ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن تعمیر شدہ انسانی ذات طبعی موت کے بعد ختم نہیں ہوتی۔ یہ ایک جوئے رواں کی طرح آگے کی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما اجتماعی نظام میں رہ کر ہوتی ہے۔ انسانی جسم کی نشوونما اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ خود کھائے لیکن انسانی ذات کی نشوونما اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے چھوڑ دے۔ یہ ایک بنیادی اصول ہے۔

قانون مکافات عمل

دین کی ساری عمارت قانون مکافات عمل پر استوار ہوتی ہے۔ یہ دنیا Cause and Effect کی دنیا ہے۔ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ ارادہ تک بھی خدا کے قانون کے مطابق اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔ قرآن کی رو سے یہ تمام کارگہ حیات قانون مکافات عمل کو بروئے کار لانے کے لئے سرگرم عمل ہے۔ (۲۲/۴۵، ۳۱/۵۳) کائنات میں خدا کا میزان عدل قائم ہے جس میں ہر انسان کے عمل کا ذرہ ذرہ تلتا ہے۔ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ O وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ O (۸-۷/۹۹) حتیٰ کہ نگاہ کی خیانت اور دل کا ارادہ تک بھی (۴۰/۱۹)۔ ہر شخص جو قانون خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کا ایک اثر خود اس کی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ ہر مجرم خود اپنی ذات کے خلاف ارتکاب جرم کرتا ہے۔ (۴/۱۱۱) لہٰذا اس کا نتیجہ اسے خود بھگتنا پڑتا ہے۔ (۲/۲۸۶) اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ (۷/۱۷، ۱۵/۱۷) جو شخص آگ میں انگلی ڈالے گا اس کی تکلیف اسی کو ہو گی۔

احترام آدمیت

ایک مستقل قدر ہے چونکہ انسانی ذات ہر انسانی بچے کو یکساں طور پر ملتی ہے اس لئے ہر انسان محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب الاحترام قرار پاتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ (۷۰/۱۷)۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمام فرزندان آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔ اس سے ذات پات، حسب نسب اور رنگ و نسل کے تمام امتیازات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

تعین مدارج

بنیادی طور پر ہر انسانی بچے کی تکریم محض انسان ہونے کی وجہ سے کی جائے گی، لیکن معاشرے میں مدارج کا تعین افراد کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی رو سے ہوگا۔ حسن کارانہ انداز سے (متوازن) زندگی بسر کرنے والے قابل ستائش ہوں گے۔ (۲/۱۹۵)۔

درجات کا تعین ہر ایک کے کام کے مطابق ہوگا۔ (۴۶/۱۹)۔ جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کے مطابق

زندگی بسر کرے گا وہ سب سے زیادہ واجب التکریم ہو گا۔ (۴۹/۱۳) معاشرے میں جو لوگ تنہا رہ جائیں انہیں ذلت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا۔ (۸۹/۱۷)۔

حکومت

یہ پہلے بیان کر چکا ہوں کہ قرآنی معاشرہ میں ہر معاملے کے فیصلے کا آخری اختیار قرآن کے قوانین کو ہوگا۔ لیکن خدا کی کتاب کی محکومیت انفرادی طور پر اختیار نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لئے ایک انسانی مشینری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان معنوں میں قرآن اس ہیئت اجتماعیہ کو جو تمدنی نظم ونسق کو کتاب اللہ کے مطابق چلائے حاکم تسلیم کرتا ہے۔ یہ جماعت مومنین اس صورت میں کتاب اللہ کے مطابق نظم ونسق قائم کرے گی جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو، چنانچہ جماعت مومنین کے لئے تمکن فی الارض ضروری ہے۔ یہ تمکن ایمان اور اعمال صالحہ سے حاصل ہو گا۔ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ.....(۲۴/۵۵)۔

اور اس سے مقصود قرآنی اوامر ونواہی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل ہوگی۔ (۲۲/۴۱)۔

اس میں قرآنی راہنمائی کی روشنی میں جملہ امور کے فیصلے امت کے باہمی مشورہ سے ہوں گے۔ (۳/۱۵۸، ۴۲/۳۸) دعوت الی الخیر یعنی بھلائی کی طرف دعوت ان کا فریضہ ہو گا۔ (۲/۱۴۳) اس باب میں وہ ہر ایک سے تعاون کریں گے۔ (۵/۲)۔

اللہ تعالیٰ ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہے (۳/۳۷) اور براہ راست سنتا ہے (۲/۱۸۶) اور مظلوم کی فریاد کا جواب دیتا ہے کہ تمہاری محنت رائیگاں نہیں جائے گی (۳/۱۹۴)۔

وہ المستعان ہے (۲۱/۱۱۲)۔ جسے امداد کی واقعی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا (۳۹/۲۰) بات کا سچا ہے (۴/۸۷) کبھی بھولتا بھٹکتا نہیں (۲۰/۵۲) نوع انسان کو صحیح راہنمائی دے کر تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔ (۲/۲۵۷) دنیا میں جو حکومت اللہ کے نام پر قائم ہوگی وہ انہی صفات انہی مستقل اقدار کی حامل ہوگی اور خدا کی ان ذمہ داریوں کو پورا کرے گی۔ اس مقصد کے لئے اقتدار حاصل کرنا عین تقاضائے دین ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے حصول اقتدار لوگوں کو غلام بنانے کا حیلہ ہے لہٰذا ممنوع ہے۔ (۷/۱۴۶) جو حکومت ان اقدار کے استحکام کے لئے وجود میں آئے اس کے خلاف بغاوت انسانیت کی بارگاہ میں جرم عظیم ہے۔ (۴۲/۴۲، ۱۰/۲۳) لیکن جو نظام ان اقدار کو چھوڑ دے اس کی اطاعت وجہ تذلیل انسانیت ہے۔ (۱۸/۲۸)۔

اس نظام کے انسانیت ساز نتائج اس درخشندگی سے دنیا کے سامنے آئیں گے کہ اس کا مقابلہ کوئی غلط نظام نہیں کر سکے گا۔ (۸۱/۱۷، ۱۸/۲۱) چونکہ اس نظام کو قوانین خداوندی کی تائید ونصرت حاصل ہوگی اس لئے یہ دنیا کے تمام نظام ہائے باطل پر غالب آجائے گا۔ (۴۸/۴۸، ۲۱/۵۸) اور اس کے حاملین کو نوع

انسان کی لیڈرشپ حاصل ہوجائے گی۔(۲/۱۲۴)۔

آزادی

قرآن کریم انسانی آزادی کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور آزادی کا ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جو دنیا کے کسی اور اجتماعی نظام میں نہیں ملتا۔ وہ کہتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے خواہ اسے ضابطہ کتاب' دوسروں کے فیصلے کرنے کا اختیار' حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ دی گئی ہو۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُواْ عِبَاداً لِّي مِن دُونِ اللّه ..... (۳/۷۹)۔ انسانوں کی آزادی پر کوئی شخص کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کرسکتا۔ قرآن انسانوں کی وضع کردہ یا خودساختہ زنجیروں کو توڑنے کے لئے آیا ہے۔ (۷/۱۵۷) اور انسان کو ہر نوع کی غلامی سے آزادی دلانے کے لئے (۱۳/۹۰)۔ لیکن ظاہر ہے انسان نے مل جل کر رہنا ہو تو ہر فرد کی آزادی پر کچھ نہ کچھ پابندیاں خود انسانی تمدنی زندگی کا تقاضا ہوگا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے کسی انسان کو نہیں..... إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ أَمَرَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ.....(۱۲/۴۰)۔

ربوبیت عالمینی

قرآن کریم نے خدا کی پہلی صفت رب العلمین بتائی ہے (۱/۱) رب کے معنی ہیں جو کسی شے کو نشوونما دیتا ہو اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج اس کی تکمیل تک لے جائے اور عالمین سے مراد جملہ کائنات اور تمام عالم انسانیت ہے۔ انسان کی نشوونما میں اس کی طبعی پرورش بھی شامل ہے اور اس کی ذات کی نشوونما بھی۔ لہٰذا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد انسانیہ کی بلاتفریق مذہب وملت اور بلاامتیاز رنگ و نسل طبعی پرورش بھی ہوتی جائے اور ان کی ذات کی نشوونما بھی۔

سامان حفاظت

خدا نے بھوک اور خوف کو عذاب سے تعبیر کیا ہے۔ (۱۶/۱۱۲) بھوک کا عذاب دور کرنے کے لئے خدا کی صفت ربوبیت ورزاقیت کارفرما ہوتی ہے لیکن وہ رحیم کے ساتھ غفور بھی ہے (۲/۱۷۳) غفور کے معنی ہیں سامان حفاظت بہم پہنچانے والا۔ اس لئے اسلامی مملکت کا ایک بنیادی فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ افراد معاشرہ کی حفاظت کا پورا پورا بندوبست کرے۔ اس کے لئے قرآن میں ہے کہ خدا نے ضابطہ قوانین (کتاب) اور میزان (نظام عدل) کے ساتھ الحدید (شمشیر خاراشگاف) بھی نازل کی ہے۔ (۲۵/۵۷) چنانچہ اسلامی سلطنت کے لئے صاحب قوت ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی سے وہ مخالفین کے مقابلے میں چٹان کی طرح سخت واقع ہوگی۔ (۲۹/۴۸) اور اپنی سرحدوں کی بہترین حفاظت کرے گی۔ لیکن یہ قوت مظلوموں کی مدافعت کے لئے استعمال کی جائے گی' کسی پر ظلم کرنے کے لئے نہیں' کیونکہ خدا کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ (۳/۱۸) اس حفاظت میں مملکت کے اندر افراد معاشرہ کی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت بھی آجاتی ہے اور بیرونی دشمنوں سے خود مملکت کی حفاظت بھی۔

کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے

کائنات کے متعلق یہ نظریہ کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے ایک مستقل قدر ہے جو انسانی نگاہ کے زاویہ کو بدل دیتی ہے۔ تخلیق بالحق سے مراد یہ ہے (۲۲/۴۸) کہ کائنات یونہی فریب تخیل یا مایا یا سراب نہیں اور اسے تعمیری مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ (۸۵/۱۵، ۱۶/۲۱، ۳۸/۲۴)۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ سائنٹفک ریسرچ کے ایسے انتظام کرے کہ فکری تحقیق و عملی تجربات سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ کائنات کی کوئی شے باطل یا رائیگاں پیدا نہیں کی گئی۔ (۱۹۰-۱۸۹/۳) یہ سارا سلسلہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے اور ان قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (۷۷/۱۷)۔

عمل تخلیق

تسخیر فطرت سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کے عمل تخلیق میں حصہ لے۔ خدا کی ایک صفت تو بَدِیْعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (۲/۱۱۷) یا فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (۶/۱۴) ہے۔ بدیع اور فاطر کے معنی ہیں کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ یہ صفت صرف خدا کے لئے مخصوص ہے۔ کوئی انسان اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ البتہ خدا کی ایک اور صفت خالقیت ہے۔ خلق کے معنی ہوں گے موجودہ عناصر میں ترکیب نو سے نئی نئی چیزیں وضع کرنا۔ ان معنوں میں انسان خدا کے عمل تخلیق میں شریک ہو سکتا ہے کیونکہ خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے۔ (۲۳/۱۴)۔

عدل اور احسان

قرآنی معاشرہ کا نظام عدل انسانی اعمال کے ان اثرات سے متعلق ہے جن کا اثر خود انسانی ذات پر مرتب ہوتا ہے لیکن انسانی اعمال کا ایک اثر معاشرہ پر بھی پڑتا ہے۔ اس لئے معاشرہ میں انہی خطوط پر نظام عدل قائم کرنے کے لئے اس حکومت کا قیام ضروری ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ وہ انقلاب ہے جس کی رو سے اقتدار و اختیار ظالم اور مستبد قوتوں کے ہاتھ سے چھین کر قوانین خداوندی کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ (۲۰/۱۵) اس انقلاب سے وہ حکومت خداوندی متشکل ہوتی ہے جس میں میزان عدل استوار ہو جاتی ہے۔ (۱۷-۱۶/۴۰) اور اس میں ہر فرد اپنے اعمال کی صحیح جزا اور سزا پاتا ہے۔ (۲/۲۸۶) مجرم کا پیچھا کر کے اسے اس کے جرم کی سزا دی جاتی ہے۔ (۲/۱۷۹) لیکن کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ (۶/۱۶۵) اس میں نہ کسی کی سفارش چلتی ہے اور نہ کفارہ کام دے سکتا ہے، نہ کسی کے اثر و رسوخ (۲/۱۷۹) اس میں ہر ایک کے لئے عدل ہوتا ہے اور یکسر عدل (۴/۵۸) بلا رو رعایت عدل (۴/۱۳۵) دوست اور دشمن سب سے عدل (۵/۸) عدل کے معنی ہیں ہر معاملہ کا فیصلہ قوانین خداوندی کے مطابق (۷۰-۶۹/۳۹) ہو اور ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملے۔ (۳۹/۵۳، ۷۰/۳۹) لیکن اگر کسی کی محنت سے اس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں تو اس کی کمی کو پورا کرنا بھی اس نظام کی ذمہ داری ہے۔ اس لئے قرآن نے عدل کے بعد

احسان کا بھی حکم دیا ہے۔ (۱۶/۹۰) احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی کو پورا کر کے اس کے توازن کو برقرار کر دینا۔ جماعت مومنین کے درمیان مسابقت (یعنی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا میدان) یہ ہوگا کہ اپنی محنت کے ماحصل کو کس حد تک دوسروں کی بہبود کے لئے وقف کرتے ہیں۔ (۲/۱۴۸) دوسرے لوگوں کی کمائی پر عیش اڑانے والوں کے لئے اس مملکت میں کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ (۱۳۔۱۱/۲۱) نہ ہی ان لوگوں کے لئے جو معاشرے کا معاشی توازن بگاڑنے کی کوشش کریں۔ (۶۔۱/۸۳) دولت جمع رکھنے کا اس میں سوال ہی نہیں ہوگا کیونکہ فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہے گی۔ (۲/۲۱۹) جس طرح خون انسانی جسم میں گردش کرتا ہے اور جسم کے ہر عضو کو اس کی مناسب نشوونما مہیا کرتا ہے اسی طرح دولت قرآنی معاشرہ میں گردش کرتی ہے اور ہر ایک کے لئے سامان نشوونما مہیا کرتی ہے۔

وحدت امت

اس قسم کا معاشرہ متشکل کرنے کے لئے جو امت (جماعت مومنین) وجود میں آئے گی اس میں وحدت کا ہونا ایک مستقل قدر ہے اسی لئے امت میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (۳۲۔۳۱/۳۰) اور رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ ایسا کرنے والوں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں (۶/۱۶۰) تفرقہ خدا کا عذاب ہے (۳/۱۰۴) دین کا نظام یہ ہے کہ خدا کی کتاب کو پوری کی پوری امت، کامل یکجہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ تھامے رہے۔ (۳/۱۰۲) اور کسی قسم کا تفرقہ پیدا نہ ہو۔ اس تفرقہ میں مذہبی فرقہ بندی اور سیاسی پارٹیاں سب شامل ہیں (۴/۲۸)۔ کوئی کام بظاہر کتنا ہی بڑا نیک کیوں نہ ہو اگر اس سے امت میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے تو جرم عظیم قرار پائے گا۔ (۹/۱۰۹)۔

وحدت انسانیت

دین کا مقصد ایک عالمگیر انسانی برادری کی تشکیل ہے اس لئے وحدت انسانیت ایک مستقل قدر ہے۔ یہ وحدت آئیڈیالوجی کے اشتراک سے ہوگی۔ (۱۰/۱۹،۲/۲۱۳) کوئی ایسا اقدام جس سے انسانیت کی وحدت کی بجائے تفرقہ پیدا ہو خدا کے پروگرام کی خلاف ورزی ہوگی (۲۵،۲/۲۷۔۱۳/۲۱) جو لوگ قرآن کی آئیڈیالوجی کی صداقت کو تسلیم نہیں کریں گے وہ اس برادری کے افراد تسلیم نہیں کئے جائیں گے۔ اس اعتبار سے انسان دو قوموں میں تقسیم ہو جائیں گے، ایک وہ جو اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کریں گے اور دوسرے وہ جو اس آئیڈیالوجی سے انکار کریں (۶۴/۲)۔ لیکن جو لوگ اس برادری میں شامل نہیں ہوں گے حقوق انسانیت کے وہ بھی مستحق رہیں گے اس لئے کہ تمام بنی نوع انسان کی منفعت بخشی ایک مستقل قدر ہے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: کوئی شخص دین میں بالجبر داخل نہیں کیا جائے گا۔ (۲۹/۱۸، ۹۹/۱۰، ۲۵۶/۲) ایمان نام ہی قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد صداقت کے اقرار کا ہے۔ اس سے انسان کے اندر ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک افراد کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ ہو

خارجی دنیا میں صحیح انقلاب پیدا نہیں ہوسکتا۔(۵۳/۱۱۸/۱۳)۔

ذاتی ذمہ داری

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

ظلم: ظلم عدل کی مخالفت ہے۔لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (۲/۲۷۹) نہ تم کسی پر ظلم کرو۔نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔

عدالتی عدل

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۲/۴۲) جھوٹ کو سچ کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ سچ کو جان بوجھ کر چھپاؤ۔وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ (۲/۲۸۳) شہادت کو مت چھپاؤ۔يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۴/۱۳۵) اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لئے سچی گواہی دو۔خواہ اس میں تمہارا یا تمہارے ماں باپ کا اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو اللہ ان کا خیر خواہ ہے۔تو تم خواہش نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑو۔اور اگر تم پیچدار شہادت دو گے یا شہادت سے بچنا چاہو گے تو (جان رکھو) کہ اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔''

دشمن کے ساتھ بھی انصاف کرو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ..... أَلَّا تَعْدِلُوا .....(۵/۸)

اے ایمان والو! اللہ کے لئے انصاف کی گواہی دینے کے لئے کھڑے ہو جایا کرو اور لوگوں کی دشمنی بھی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔

پھر قرآن وکلا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: ..... وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا (۴/۱۰۵) ''یاد رکھو تم بددیانت لوگوں کی حمایت میں کبھی بحث نہ کرنا۔''

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ..... (۴/۱۰۷) ''اور جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں۔ان کی طرف سے بحث نہ کرنا۔''

''گنہگاروں کی مدد نہ کرو۔'' (۱۷/۲۸)۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر: درست کاموں کا حکم دینا اور غلط کاموں سے روکنا۔یہ بھی اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔

فساد

عدل کی ضد ہے۔اللہ فساد اور فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا۔(۲/۲۰۵)۔

امانت

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا..... (۴/۵۸) ''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دو۔'' چنانچہ قرآن کریم امانت واپس کرنے پر بے حد زور دیتا ہے لیکن حکومت کی باگ ڈور دیگر افراد کے حوالے کرنا سب سے بڑی اور مقدس امانت ہے۔چنانچہ یہ

امانت ان لوگوں کے حوالے کرو جو اسے ایمانداری سے لوٹا سکیں' جو عدل اور انصاف کے ساتھ اس ذمہ داری کو نبھا سکیں۔

معیشت

نظام اشتراکیت اور نظام سرمایہ داری عوام الناس کو نشوونما پہنچانے کی ذمہ داری میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اس مسئلہ کا واحد حل وہی ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے۔

الَّذِيْنَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ .....(۲۲/۴۱) ''یہ جماعت جو دنیا سے ظلم اور سرکشی مٹانے کے لئے اٹھی ہے اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی تو یہ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے (تاکہ افراد معاشرہ قوانین خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں) اور تمام نوع انسانی کو رزق بہم پہنچائیں گے۔''

إِنَّ اللّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الجَنَّةَ.....(۹/۱۱۱) جماعت مومنین کا نظام خداوندی کے ساتھ معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے نظام خداوندی ان کا جان و مال خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے۔ (یعنی اس دنیا میں ان کی تمام ضروریات زندگی کی بہم رسانی اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے تمام وسائل و اسباب کی فراہمی اس نظام کے ذمے ہو جاتی ہے)۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعاً ..... (۲/۲۹) چنانچہ زمین سے پیداوار کے تمام ذرائع بنی نوع انسان کے لئے ہیں (نہ کہ کسی خاص گروہ کے لئے)۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ .....(۱۰/۷) ''وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں تمکن عطا فرمایا اور زندگی گزارنے کے تمام ذرائع عطا کئے۔

سَوَاء لِّلسَّائِلِيْنَ .....(۱۰/۴۱) سب کے لئے برابر برابر۔

مفت میں ہاتھ آنے والی دولت کے پیچھے نہ پڑو۔ اپنی محنت سے کماؤ (۳۹/۵۳)۔

.....يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ ..... (۲/۲۱۹) ''اپنی کمائی میں سے بقدر ضرورت اپنے پاس رکھو اور جس قدر اس سے زائد ہو سب کا سب نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھو (تاکہ نظام خداوندی اسے ضروری مصرف میں لا سکے)۔''

دوسروں پر خرچ کرنا خیرات کا مسئلہ نہیں بلکہ حقوق انسانی (Human Rights) کا مسئلہ ہے۔ جن کو تم دیتے ہو یہ نہ سمجھو کہ تم ان پر احسان دھرتے ہو۔ قطعاً نہیں۔ یہ تو محض اللہ کے حکم کی بجا آوری ہے۔ دینے والا تو شکریہ کا بھی مستحق نہیں۔ (۹/۷۶) دوسروں پر خرچ کرنا خود اپنی ذات کی پرورش اور استحکام کے لئے ہے۔ (۲/۲۶۵)۔

اسلامی معاشرے کی حفاظت کی اہمیت

مومنین کو حکم دیا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی حفاظت کرو۔ جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی ان سے اللہ کی راہ

میں لڑو مگر زیادتی مت کرو۔ (۲/۱۹۰) ان سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فساد نابود نہ ہو جائے اور اللہ کا دین ہی باقی رہے۔ (۲/۱۹۳)۔

مستقل اقدار اعمال انسانی کے لئے ایک حد (Boundry Line) مقرر کرتے ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں روزمرہ کے معاملات اس حد کے اندر رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے حل کئے جاتے ہیں۔ أَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ اللہ کے رسولؐ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ آپ کو حکم دیا جاتا ہے۔ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸)۔

میں نے مندرجہ بالا سطور میں وہ مستقل اقدار اختصار کے ساتھ بیان کر دی ہیں جو قرآن کریم کے مطالعے سے نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی قرآن کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں۔

ہم پاکستانی عرصہ نصف صدی سے ان مشکلات میں گھرے چلے آ رہے ہیں جو کہ ہماری خود پیدا کردہ ہیں۔ اسلئے کہ ہم نے قرآن کے نظام میں مغربی جمہوریت کا پیوند لگا کر اسے مجسم خرافات میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب ان مشکلات سے باہر نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ قرآن کی مستقل اقدار پر سختی سے عمل کر کے مغربی جمہوریت کے راستے کو ٹھکرا دیا جائے تا کہ امور مملکت میں اللہ کی حاکمیت قائم کی جا سکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(بشیر احمد عابد، کویت)

پرویزؒ صاحب اور فہم قرآن۔ تحریف معنوی یا ارتقائے فکر...!

طلوع اسلام کے شمارہ دسمبر ۲۰۰۷ء میں بانی ادارہ طلوع اسلام جناب غلام احمد پرویزؒ کے فہم قرآن اور فہم دین سے متعلق جناب جاوید احمد غامدی کے اعتراضات پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ادارہ طلوع اسلام کے چیرمین ڈاکٹر انعام الحق نے ان اعتراضات کا نہایت تفصیل سے جائزہ لے کر مدلل جواب دیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے نہ صرف غامدی صاحب بلکہ دیگر معترضین کی بھی تسلی ہو جائیگی۔ ان کے جواب کے بعد اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت یا گنجائش تو نہ تھی لیکن مجھے جاوید احمد غامدی صاحب کے طرز استدلال پر حیرت ہوئی۔ میرے لیے یہ استدلال غیر متوقع تھا۔ بالخصوص ایک روشن خیال اور وسیع النظر صاحب علم کی طرف سے۔! اس ضمن میں چند گذارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جناب غامدی صاحب کا میرے دل میں بہت احترام ہے۔ میں نے آپ کی کتب تو نہیں پڑھیں البتہ مختلف ٹی وی چینلز پر آپ کی گفتگو اور بحث ومباحثہ کو بڑے غور سے سنتا ہوں۔ فہم دین سے متعلق آپ کا نقطہ نظر مروّجہ مفہوم سے کافی بہتر اور ترقی یافتہ ہے۔

اگر چہ بیشتر علماء کو آپ سے اختلاف ہے (ہمیں بھی ہے) لیکن اس کے باوجود ہم آپ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں پر اپنی رائے مسلط کرے۔ ہمیں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو غور سے سننا چاہیے اور صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے۔ اگر کسی کو کسی سے اختلاف ہے تو بجائے الزام تراشی اور طعن وتشنیع کے اسے چاہیے کہ وہ ان کا علمی جائزہ لے کر اپنے نقطہ نظر کو دلائل و براہین سے واضح کرے۔ آزادی فکر اور آزادی اظہار رائے ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ ہمیں اس کا احترام کرنا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ انسان کے ذہن کی نشوونما اور ارتقائے فہمِ دین کے لئے اس آزادی کا ہونا بہت ضروری ہے۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ غامدی صاحب اپنے تمام تر اجتہادی اوصاف اور بالغ النظری کے باوجود پرویزؒ صاحب کو فہم قرآن اور فہم دین میں تحریف معنوی کا مرتکب قرار دیتے ہیں۔ میری نگاہ میں یہ ایک نہایت سنگین

الزام ہے اور کسی صاحب علم کو بلا ثبوت اس کا مرتکب ٹھہرانا جرم سے کم نہیں۔ خدا ہمیں ایسے الزامات سے محفوظ رکھے۔

معلوم نہیں غامدی صاحب تحریف معنوی اور اختلاف فہم میں کوئی فرق روا رکھتے ہیں یا نہیں (کیونکہ آپ نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی) لیکن ہمارے نزدیک ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے' اور وہ ہے نیت اور ارادہ کا فرق۔ تحریف معنوی اسے کہتے ہیں جب کوئی انسان اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے کسی لفظ یا بات کو ارادۃً توڑ موڑ کر پیش کرے۔ یہ سراسر خیانت اور بدنیتی پر مبنی ہوتا ہے۔ جبکہ اختلاف فہم اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ ایک انسان کی کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے اس کے خلوص نیت اور شدید خواہش کا مظہر ہوتا ہے۔ تحریف معنوی میں فساد و بربادی کا عنصر پوشیدہ ہوتا ہے۔ جبکہ اختلاف فہم اصلاح و تعمیر کا پہلو لیے ہوتا ہے۔ اختلاف فہم انسان کے زندہ ضمیر اور آزادی فکر کی علامت ہوتا ہے۔ تحریف معنوی سے انسان پستی کی طرف لڑھک جاتا ہے۔ جبکہ اختلاف فہم سے انسان رفعت و عظمت کی بلندی کو چھوتا ہے۔ ہمارے ہاں علماء کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اختلاف رائے کو تحریف معنوی سمجھا اور جس کسی نے بھی انکے مخصوص مکتب فکر سے اختلاف کیا' اسے کافر گردانا۔ علماء کی اس روش نے اُمت کی غور و فکر کرنے کی صلاحیت کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس سے مسلمانوں میں ارتقائے فکر رک گئی اور ان پر فکری جمود طاری ہو گیا۔ ان میں تخلیقی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں۔ وہ اقوام عالم میں بہت پیچھے رہ گئے اور آج وہ ذلت و پستی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

آج بھی مفاد پرست طبقات نے ان پر آزادانہ سوچ اور فکر کی راہیں بند کر رکھی ہیں اور اپنی رائے سے کسی قسم کا اختلاف ناقابل برداشت اور ممنوع قرار دیا ہوا ہے۔ اس جرم میں مسلمان حکمران اور علماء دین دونوں برابر کے شریک ہیں۔ حکمرانوں نے کالے قوانین کے ذریعے اور علماء نے جھوٹے فتوؤں کے بل بوتے پر امت کے سنجیدہ' باشعور' مخلص اور ذہین طبقے کو اپنے شکنجے میں کس رکھا ہے۔ آپ ان کی غلط سوچ' غلط اعمال اور کرتوتوں کے خلاف ایک بات نہیں کہ سکتے نہ کوئی حرف شکایت زبان پر لا سکتے ہیں۔

دراصل یہ حضرات آزادی فکر اور آزادی اظہار رائے کی اہمیت اور قدر پہچان ہی نہیں سکے۔ شاید انہیں معلوم نہیں کہ انسان کا بنیادی امتیاز اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے جبکہ حیوانات اس صلاحیت سے محروم ہیں۔ اگر انسان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو دبا دیا جائے یا سلب کر لیا جائے تو وہ حیوانی سطح پر چلا جائیگا اور اس کی فکری ارتقاء رک جائیگی۔ وہ بیل کی طرح موٹا تو ہوتا رہے گا لیکن عقل و شعور سے عاری ہوگا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک انسان چاند کو چندا

ماموں اور زمین کو انڈہ سمجھتا رہا' یعنی قوانین فطرت سے غافل رہا اور توہم پرستیوں کے اندھیرے میں گم رہا تب تک وہ کائنات کی ادنیٰ سے ادنیٰ شے کا بھی سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ کائنات میں برپا آندھیوں' طوفانوں' زلزلوں اور سیلابوں کا مقابلہ تو درکنار وہ ان سے بچنے کے لئے اپنے سے کمزور اور کمتر اشیاء یعنی پہاڑوں' پیڑوں، اور حیوانوں کی پوجا پاٹ میں پناہ تلاش کرتا تھا۔ لیکن وہ جب ارتقائے فکر کی اس سطح پر پہنچا جہاں اس پر یہ راز افشا ہوا کہ کائنات کی ہر شے نپے تلے قوانین کے تابع چل رہی ہے' ہر شے کے لیے ایک قاعدہ اور کلیہ ہے تو اس نے ان تمام کا علم حاصل کر کے انہیں اپنے سامنے جھکا دیا۔ علم کی قوت سے اس نے ہر شے کو مسخر کیا اور کل تک وہ جن بے جان اور شعور سے عاری اشیاء کے سامنے سجدہ ریز تھا آج وہ اس کے اشاروں پر ناچ رہی ہیں۔ وہ اس کے حکم سے سرمو انحراف نہیں کر سکتیں۔ مثال کے طور پر کشش ثقل کو لیجئے' یہ ایک عظیم کائناتی قوت ہے۔ اس نے عظیم الجثہ کروں اور کائناتی اجسام کو اپنی گرفت میں اس مضبوطی سے جکڑ رکھا ہے کہ یہ ذرہ بھر اس کے مخالف حرکت نہیں کر سکتے۔ کشش ثقل کے قانون کے مطابق پانی کو ہمیشہ بلندی سے پستی کی طرف بہنا چاہیے اور زمین ہر شے کو اپنے ساتھ کس کر رکھے گی۔ لیکن انسان نے اپنی علمی استعداد بڑھا کر کشش ثقل کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ایسی مشینیں ایجاد کیں جن کے ذریعے وہ جس سمت چاہے پانی کو بھگا سکتا ہے۔ اور جب چاہے زمین کی گرفت سے آزاد ہو کر کائنات کی وسعتوں کو پاٹ سکتا ہے۔ صرف ایک ڈونکی پمپ یا جٹ انجن کی کارکردگی کو لیجئے ایک سوئچ آن کرنے سے کشش ثقل کے قانون کا سارا دم خم نکل جاتا ہے۔ مجال ہے کہ وہ حضرت انسان کی حکم عدولی کر سکے۔ انسان کی علمی فضیلت اور برتری کی یہ ایک ادنیٰ مثال ہے۔ ایسی ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ واضح رہے کہ ان مثالوں کا یہ مطلب نہیں کہ انسان قوانین فطرت کو توڑ سکتا ہے۔ قطعی نہیں۔ قوانین فطرت اٹل اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔ ان کو توڑنا یا ان سے سرکشی اختیار کرنا انتہائی مہلک ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی علمی استعداد بڑھا کر ان قوانین سے بہتر اور محفوظ طور پر نپٹ سکتا ہے۔

انسان کی علمی استعداد اشیائے کائنات اور مظاہر فطرت پر غور و فکر کرنے سے بڑھتی ہے۔ اگر کوئی قوم اسلاف کی اندھی تقلید پر ڈٹ جائے' توہم پرستیوں کے تانے بانے میں الجھ جائے' وقت اور حالات کے مطابق غور و فکر کرنا ترک کر دے تو وہ قوم یہ علمی استعداد اور قوت حاصل نہیں کر سکتی۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی معاشرے میں آزادی اظہار رائے کا حق سلب کر لیا جائے تو پھر لوگ رفتہ رفتہ غور و فکر کرنا ترک کر دیتے ہیں۔ ان کی سوچ و فکر مفاد پرستی کے دائروں میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے

اوران کی پرواز فکر ایک پر کٹے پنچھی کی طرح سمٹ کر مالک کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے۔ ان سے شرف ومجد کی زندگی چھن جاتی ہے۔ بالعکس' اظہار رائے کی آزادی سے انسان کی سوچ وفکر میں وسعت و بلندی پیدا ہوتی ہے' قومی یک جہتی اور اتحاد کو فروغ ملتا ہے اور معاشرہ نشو وارتقاء اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اقوام کی عظمت و عروج کا باعث اعلیٰ سوچ وفکر ہوتی ہے۔ جو قوم جتنی بلند اور شستہ فکر کی حامل ہوگی وہ اتنی ہی طاقت ور' مضبوط اور ترقی یافتہ ہوگی۔ پست فکر قومیں نہ ترقی کرتی ہیں اور نہ ہی عزت ووقار کی زندگی بسر کرسکتی ہیں۔ آج کے دور میں اس کی بیّن مثال مسلم اقوام ہیں۔ ان کے پاس بے پناہ مادی وسائل اور افرادی قوت ہے' لیکن اس کے باوجود ذلت وخواری کے جہنم میں جل بھن رہی ہیں' اور اس سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ قرآن کریم نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ اگر تم اسلاف کی روّش پر یونہی بلا سوچے سمجھے چلتے رہے اور اگر تم نے اکثریت کے فیصلوں کو بلا تحقیق تسلیم کیا تو یاد رکھو تم کبھی ہدایت نہیں پاسکو گے (۱)۔ لیکن افسوس کہ یہ اپنی آنکھ' کان' اور دل و دماغ رکھنے کے باوجّود انہیں استعمال میں نہیں لاتے اور انہی کی آنکھوں' کانوں اور دل و دماغ سے دیکھنے' سننے' اور سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں (۲)۔ علم حاصل کرنے اور ہدایت پانے کے لیے ہر انسان کو اپنی سمع و بصر کو پوری آزادی کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو العلم کہا ہے (۳)۔ یعنی قرآن کریم ایسی تعلیمات کا مجموعہ ہے جو اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ یوں تو ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ کا علم بکھرا پڑا ہے (۴) اور ہر انسان اسے اپنی استعداد کے مطابق حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا علم خاص ہے۔ یہ صرف قرآن کریم سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے (۵)۔ علم کا بنیادی مقصد عقل کی رہنمائی کرنا ہے (۶) تاکہ انسان حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کا صحیح تجزیہ کر کے صحیح نتائج اخذ کر سکے۔ قرآن کریم کے مطابق کسی بات یا عمل کے صحیح ہونے کی دلیل ہرگز یہ نہیں کہ ایسا ایک زمانے سے نسل در نسل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ قرآن اندھی تقلید کی سخت مخالفت کرتا ہے (۷)۔ قرآن اس دلیل کو بھی نہیں مانتا کہ کوئی بات یا عمل اس لیے صحیح ہے کہ اس میں امت کا اجتماعی تعامل شامل ہے (۸)۔ یہ دونوں دلیلیں علم کی کسوٹی پر کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اگر زمانے کی طوالت یا اسلاف کی روش یا لوگوں کا اجتماعی تعامل صداقت کی دلیل قرار پاتے اور کائناتی حقائق پر اثر انداز ہوتے تو آج دنیا میں ایک بھی نئی شئے' نئی تہذیب' نیا ماحول وجود میں نہ آتا۔ انسان حیوانات کی طرح ارتقاء کی ایک منزل بھی طے نہ کرسکتا۔ جس طرح ایک گائے اربوں سالوں سے ایک گائے ہی چلی آ رہی ہے۔ نہ اس کی ذات میں کوئی تبدیلی آئی ہے اور نہ ہی ماحول میں۔

جبکہ انسان کی کیفیت اس کے بالکل برعکس ہے۔ انسان کی ذات اور ماحول میں حیران کن تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں' اور ہوتی چلی جا رہی ہیں(۹)۔ انسان سحر کی دنیا سے نکل کر سائنس کی دنیا میں داخل ہو چکا ہے۔ کل تک جو شے اسے ناممکن دکھائی دیتی تھی' آج وہ اس کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ جو خواب تھے وہ حقیقت بن چکے ہیں۔ انسان کی سوچ وفکر اور تہذیب وتمدن مسلسل اور بتدریج مائل بہ عروج ہے۔ اگر انسان اسلاف کی روش سے انحراف نہ کرتا اور اپنے آپ کو زمان ومکان کی قید میں جکڑے رکھتا تو پھر جو ہے' جہاں ہے' ویسا ہی رہتا۔ انسان نشو وارتقاء اور ترقی کی راہ پر ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتا۔

ہم نے انسان کی آزادی فکر اور آزادی اظہار رائے پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ آزادی انسان کی تخلیق اور فطرت کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انسان کو دیگر اشیائے کائنات پر فضیلت دیتی ہے۔ اس لیے قطع نظر اس کے کہ ہم کس مذہب یا کس تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں' ہمیں اس آزادی کا احترام کرنا چاہیے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ آزادی فکر کا مسئلہ ہے۔ ایک بھی اسلامی معاشرہ ایسا نہیں جہاں انسان کو آزادانہ سوچ اور اظہار رائے کی آزادی ہو۔ ایک طرف شاہی فرامین نے فکر کو پابند سلاسل کر رکھا ہے تو دوسری طرف مفتیان کرام کے فتووں نے ذہنوں کو مفلوج کر رکھا ہے۔ دنیاوی امور ہوں یا دینی دونوں میں جدت افکار کا فقدان ہے۔ عالم اسلام کے جو بھی سیاسی' معاشرتی' اور معاشی مسائل ہیں مثال کے طور پر' وحدت امت کا مسئلہ' معاشرے میں عورت کے صحیح مقام کا مسئلہ' کاروبار میں سودی لین دین کا مسئلہ وغیرہ سب اسی فکری جمود اور جبر کا نتیجہ ہیں۔ امت کے تعلیم یافتہ اور باشعور طبقے کی اکثریت ذہنی طور پر اپاہج ہو چکی ہے۔ بہت کم علماء' دانشور' اور مفکر ایسے ہیں جو اپنا نقطہ نظر کھل کر پیش کرنے کی ہمت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ محترم پرویزؒ صاحب کا شمار بھی ایسے ہی نڈر اور بیباک علماء میں ہوتا ہے۔ آپ نے جان ہتھیلی پر رکھ کر حق کی آواز بلند کی' اور جسے صحیح سمجھا اسے بلاخوف پیش کیا۔

بدبختی سے مسلمانوں کے ہاں تعلیم وتحقیق کا عمل بوجوہ فروغ نہیں پا سکا' بالخصوص فہم دین سے متعلق تو تمام راستے مسدود کر دیئے گئے۔ جب مسلمان حکمرانوں نے سیاسی وابستگیاں پیدا کر لیں تو دین اپنی وحدت برقرار نہ رکھ سکا۔ یہ مذہب اور سیاست میں بٹ گیا جس سے امت شدید سیاسی اور مذہبی فرقہ واریت کا شکار ہوگئی جو آج تک برقرار ہے۔ مفاد پرست طبقے نے آزادی اظہار رائے چھین لی اور اختلاف رائے کو جرم قرار دے دیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہم اپنے عقاید اور مکتب فکر سے اختلاف رکھنے والے ہر صاحب علم کو حقارت کی نگاہ سے

دیکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں اور کتب پر سرسری نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اگرچہ محترم غامدی صاحب نے کہا ہے کہ میں نے پرویزؒ صاحب کی تمام اہم کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن آپ کے طرز استدلال اور تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ مطالعہ توجہ اور دلچسپی سے نہیں کیا۔ ہمارے ہاں یہ روش بھی عام ہے کہ کسی سکالر کی ایک آدھ تصنیف کا مطالعہ کر کے اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس نے باقی سب کچھ بھی ایسا ہی لکھا ہوگا۔ جس طرح ایک باورچی دیگ کے چند دانے دیکھ کر اندازہ کر لیتا ہے کہ چاول تیار ہو گئے ہیں' اسی طرح ہم نے اپنے علاوہ دیگر علماء کے لٹریچر کو چاولوں کی دیگ سمجھ رکھا ہوتا ہے' جس میں سے چند اوراق پڑھ کر تبصرہ فرما دیا کہ یہ سب بکواس ہے۔ یہ رویہ تو پھر بھی گوارہ ہے' زیادہ نہ سہی کم از کم کچھ تو تکلف کرتے ہیں' ادھر تو ہم نے ایسے علماء دیکھے ہیں جو اتنی تیز نگاہ اور بصیرت افلاطونی کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ ایک اشارے سے سب بات سمجھ جاتے ہیں۔ خاص کر ان علماء کو جن سے وہ اختلاف رکھتے ہوں۔ مثال کے طور پر جب ان سے ذکر کیا جائے کہ فلاں معاملے میں پرویزؒ صاحب کا نقطہ نظر یوں ہے تو وہ فوراً چلا اٹھیں گے۔ بس! ساری بات سمجھ میں آ گئی' پرویزؒ صاحب کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ حضرات ٹھہر کر' بات غور سے سننے کی بجائے منہ بسور کر چل پڑتے ہیں' یہ کہتے ہوئے کہ یہ شخص تو عجیب باتیں کرتا ہے۔ اس سے پہلے ایسی باتیں ہم نے کہیں نہیں سنیں (۱۰)۔ قرآن کریم میں کئی مقامات ایسے ہیں جن کا علمائے سلف بخوبی احاطہ نہیں کر سکے۔ یہ ان کا قصور نہیں تھا بلکہ انسانی علوم اور تہذیب وتمدن نے ابھی اتنی ترقی ہی نہیں کی تھی جتنی ہمارے دور میں ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی دیگر مقامات ایسے ہیں جو آئندہ ادوار میں غور و فکر کے متقاضی ہوں گے۔ جوں جوں انسانی علم و تجربہ فروغ پائے گا' نئے نئے حقائق منکشف ہوتے رہیں گے۔ یہی وہ مقامات ہیں جو ہم سے تدبر فی القرآن کا تقاضا کرتے ہیں۔ ہم اگر ایسے مقامات پر' جہاں انسان کے علم و تجربہ کے خلاف بات ہو رہی ہو' رک کر غور وفکر نہیں کریں گے تو پھر تدبر فی القرآن کہاں کیا جائے گا؟ محترم غامدی صاحب خود بھی تدبر فی القرآن کے بہت بڑے حامی ہیں۔ لہذا' آپ کو تو ان علماء کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جو اندھی تقلید اور اجتماعی تعامل کے اندھیروں سے نکل کر تدبر فی القرآن کا مسلک اختیار کرتے ہیں۔

محترم پرویزؒ صاحب کا مروجہ مفہوم سے اختلاف

خالصتاً تدبر فی القرآن کا نتیجہ تھا۔ آپ کو یونہی علمی جست لگانے یا قلابازی کھانے کا شوق نہیں تھا۔ قرآن کریم کے بعض مقامات فی الواقعہ سوال بن کر اٹھتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس آیہ کریمہ کو لیجئے۔ (وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ ۰۰۰ اے نبی! تجھ سے یہ جبال کے بارے میں پوچھتے ہیں۰۰۰؟ (۱۱) اس آیہ کریمہ میں سوچنے کا مقام یہ

ہے کہ عربوں اور جبال کا باہمی تعلق کیا تھا؟ عربوں کو پہاڑوں سے کیا دلچسپی تھی؟ کیا وہ جیالوجی کے طالبعلم تھے یا کوہ پیماء؟ سوال کی یہ وجہ بھی نہیں ہوسکتی کہ ان کے لیے پہاڑ حیراں کن تھے' کیونکہ خطۂ عرب میں ایسے پہاڑ ہیں ہی نہیں جو ہمالیہ اور ہندوکش کی طرح حیرت و استعجاب کا موجب ہوں۔ نہ ہی یہ پہاڑ ان کے کاروبارِ زندگی میں حائل تھے۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ انھوں نے کوئی سڑک بنانی تھی یا کھیتی باڑی کے لیے زمین حاصل کرنی تھی' اس لیے انھوں نے پوچھا کہ ان پہاڑوں کا کیا ہوگا؟ اور اس پر مستزاد قرآن کریم کا جواب' جو خود سوال سے بھی زیادہ غور و فکر کا متقاضی ہے؟ کہا! •••فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّىْ نَسْفاً Oفَيَذَرُهَا قَاعاً صَفْصَفاً Oلَا تَرَى فِيْهَا عِوَجاً وَلَا أَمْتاً O•••ان سے کہ دو کہ میرا نشو و نما دینے والا انہیں جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پرکاہ کی مانند اڑا دے گا اور یہ ایسے سیدھے اور ہموار ہو جائیں گے کہ تو دیکھے گا نہ ان میں کوئی ٹیڑھا پن باقی رہے گا' نہ اونچ نیچ•••( )۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارے علماء نے ایسے مقامات پر غور و فکر کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ ان مقامات سے بھاگتے ہوئے نکل گئے۔ اگر تھوڑی دیر رکتے اور سوچتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ لفظ جبال عرب معاشرے کا معروف استعارہ ہے جسے وہ امراءٗ رؤسا' اور سرداروں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ پہاڑوں کی طرح مضبوط کھڑے ہیں۔ ان سے ٹکرانا آسان نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ایک لفظ نے مفہوم کو کیا سے کیا بنا دیا۔ ایک بے معنی بات کو کسقدر معنی خیز بنا دیا۔ جبال کے لغوی معنی لینے کی بجائے استعاراتی معنی نے بات کسقدر واضح کر دی۔ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ ہم نے یہاں استعاراتی معنی کیوں لیے؟ فہم قرآن کے چند اصول ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ کبھی کوئی بات اپنے بنیادی موضوع سے ہٹ کر نہیں کرتا۔ قرآن کریم کا بنیادی موضوع فلاح انسان ہے جسے ابتداء ہی میں سورہ بقرۃ کی چند آیات میں بیان کر دیا ہے۔ (۱۲)۔ اس موضوع سے ہٹ کر کوئی بھی مفہوم ہوگا وہاں رک کر سوچنا پڑے گا۔ ایک جبال وہ ہیں جو سطح زمین پر ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں اور ایک جبال وہ ہیں جو انسانی معاشرے میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں۔ زیرنظر آیہ کریمہ میں اکثر علماء نے اوالذکر مفہوم لیا ہے۔ لیکن فلاح انسانیت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو دوسرا مفہوم زیادہ معقول اور صحیح دکھائی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ جو جبال سطح زمین پر ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں قرآن نے خود ان کا شمار نعمائے خداوندی میں کیا ہے۔ لہٰذا' انہیں مٹانے اور سیدھا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خطرناک جبال وہ ہیں جو انسانی معاشرے میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ امراءٗ رؤسا' اور سرداروں کے سوا کون ہوسکتا ہے؟ یہی لوگ ہیں جو معاشرے میں اونچ نیچ

پیدا کرتے ہیں' اور قرآن کریم کے نظام عدل ومساوات کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

محترم پرویزؒ صاحب نے فہم قرآن اور فہم دین کے مروجہ مفہوم سے جہاں جہاں اختلاف کیا ہے علیٰ وجہ البصیرت کیا ہے۔ بلکہ ہم تو اسے اختلاف ہی نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک یہ ارتقائے فکر کا لازمی نتیجہ ہے۔ با الفاظ دیگر آپ نے علمائے سلف کے فہم دین کو قرآن کریم کی وسعت سے ہمکنار کیا ہے۔ قرآن کریم کے وہ معنی جو ماضی کے علمی وفکری تقاضوں کے عین مطابق تھے وہ عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسا احسن کام ہے جو ہر سکالر کو کرنا چاہیے۔ پرویزؒ صاحب نے یہی سوچ کر اس طرف قدم اٹھایا تھا۔ لیکن چونکہ ہمارے علماء کی اکثریت کو رانہ تقلید اور ''اجتماعی تعامل'' کی عادی ہے اور چونکہ ان کے نزدیک دین کے معاملے میں تحقیق وتدقیق اور اجتہاد کرنا ممنوع ہے اس لئے ان کی نظر میں پرویز صاحب کا یہ قدم دین میں تحریف اور اختلاف پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ مشکل یہ کہ یہ حضرات نہ تو خود آگے بڑھتے ہیں اور نہ دوسروں کو بڑھنے دیتے ہیں۔ آج تک جتنی بھی قرآن کریم کی تفسیریں اور شرحیں لکھی گئی ہیں ان میں۔ الا ماشاء اللہ۔ رتی بھر فرق نہیں ملے گا۔ جو تفسیر آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے لکھی گئی تھی یہ حضرات اسی کا تازہ ایڈیشن اپنے نام سے چھپوا کر عالم دین بن بیٹھتے ہیں' اور پھر حیراں ہوتے ہیں کہ لوگ ان کی باتوں پر عمل نہیں کرتے اور دین سے دن بدن دور ہوتے جا رہے ہیں۔ قصور مسلمانوں کا نہیں بلکہ ان علماء کا ہے جنہوں نے ارتقائے علم وفکر کے اصول کو نظر انداز کیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسانیت پھر سے لوٹ کر ڈیڑھ ہزار برس پیچھے چلی جائے لیکن ایسا ناممکن ہے۔ یہ انسانیت اور فطرت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ ماضی خواہ کتنا ہی پاکیزہ و برگزیدہ اور خواہ کتنا ہی امن وخوشحالی کا حسین نمونہ کیوں نہ ہو' انسان کو ہر حال میں' زمانہ حال میں رہنا ہے۔ اسے آگے بڑھنا ہے ورنہ وہ مٹ جائیگا۔

محترم پرویزؒ صاحب ایک درویش صفت انسان تھے۔ آپ نے تمام عمر گمنامی میں گذار دی۔ باوجود اس حقیقت کے کہ آپ کے پایہ کا کوئی سکالر آج تک عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوا۔ آپ تحریک پاکستان کے پرجوش اور سرگرم کارکن تھے۔ علمائے دین کی طرف سے تحریک پاکستان کی مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آپ کو قائداعظمؒ کی خصوصی توجہ اور شفقت حاصل تھی جس کا ذکر قائداعظمؒ کے مکتوبات میں ملتا ہے۔ آپ نے قرآن کریم کے مطالعہ میں پچاس برس صرف کیے۔ آپ کے پیش نظر صرف ایک ہی سوال تھا۔ وہ یہ کہ کیوں امت مسلمہ ایک طویل عرصے سے پستی اور زبوں حالی کا شکار ہے؟ قرآن کریم کے مطابق اس امت کو اقوام عالم کی صف اول میں ہونا چاہیے بلکہ اس

سے بھی زیادہ اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہونا چاہیے۔(۱۳)۔لیکن کیفیت اس کی یہ ہے کہ یہ مسلسل ذلت وخواری اور پستی کی طرف لڑھکتی جارہی ہے۔اس سوال کے جواب کی تلاش میں آپ ایک طویل عرصے تک سرگرداں رہے۔آپ کا ایمان تھا کہ نہ تو قرآن کریم کی تعلیمات غلط ہوسکتی ہیں اور نہ ہی حضورﷺ کی سیرت مبارک۔ دونوں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ مومن کبھی پست یا مغلوب نہیں ہو سکتا۔آپ نے ماضی سے لیکر عصر حاضر تک کے تمام جید علمائے دین کی علمی کاوشوں کا بغور جائزہ لیا اور بعد از بسیار تحقیق اپنا نقطہ نظر پیش کیا اور فہم دین کے سلسلے میں ایک ضخیم اور نہایت مفید لٹریچر تصنیف کیا۔آپ نے جو کچھ بیان کیا ذاتی مفاد اور پسند و ناپسند سے بلند ہوکر، دلائل و براہین کے ساتھ بیان کیا۔ جو لوگ آپ کے لٹریچر کا بغور اور سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہیں ان پر یہ حقیقت از خود واضح ہو جاتی ہے۔ وہ آپ کی علمی دیانت اور خلوص پر ذرہ بھر شک نہیں کرتے۔لیکن کچھ حضرات کو آپ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ یہ آپ کے لٹریچر کو سنجیدگی سے نہیں پڑھتے اور یونہی بلا جواز' بلا دلیل الزام تراشی کرتے ہیں۔

پرویزؒ صاحب نے قرآن کریم کے مروجہ مفہوم سے جہاں جہاں اختلاف کیا ہے اس کی باقاعدہ سند اور دلیل مہیا کی ہے۔ بقول آپ کے (ان مقامات میں دیکھنا یہ چاہیے کہ جو مفہوم میں نے پیش کیا ہے' وہ ان الفاظ کے بنیادی معنی اور قرآن کریم کی کلی تعلیم کے خلاف تو نہیں۔ اس کے لیے لغات القرآن کے متعلقہ مقامات کا مطالعہ ضروری ہوگا' جہاں سے آپ کو میرے پیش کردہ مفہوم کی تشریح' دلیل اور سند مل جائیگی۔(۱۴)۔

درحقیقت' اگر قرآن فہمی کے بنیادی اصولوں کو مد نظر رکھا جائے تو قرآن کریم کی تعبیر وتشریح میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ کتاب عظیم ایک منفرد اور نادر تخلیق ہے۔نہ خود اس میں کوئی اختلاف ہے اور نہ یہ اختلاف پیدا کرتی ہے۔اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔(۱۵)۔لہٰذا جو شخص بھی اس میں اختلاف پاتا ہے' اس کا یا تو علم ناقص ہے' یا پھر اس نے اس کا مطالعہ خالی الذہن ہوکر نہیں کیا۔الراسخ فی العلم اور اولوالعلم قائما بالقسط کے لیے قرآن کریم سے زیادہ بین اور واضح کتاب اور کوئی نہیں۔ یہ ہدایت اور رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔اور ایسی ہدایت اور رہنمائی کا کیا فائدہ جو ایک انسان کو مشرق کی طرف لے جائے اور دوسرے کو مغرب کی طرف۔قرآن کریم کی بنیادی صفت یہ ہے کہ یہ ہر انسان کو صراط مستقیم پر ڈالتی ہے۔یعنی بالکل سیدھی اور متوازن راہ۔ایسی راہ کہ جس میں ظاہری ٹیڑھ پن تو کجا نظری ٹیڑھ پن بھی نہیں۔(۱۶)۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو: الحق: کہا ہے۔یعنی یہ ان حقائق پر مبنی ہے جو وجود ذہنی ہی نہیں بلکہ وجود خارجی بھی رکھتے ہیں اور علم و

برہان کی ہر کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ اس کتاب میں کوئی بات ریب و تشکیک کی نہیں' کوئی شے ظن و قیاس کی نہیں' کوئی شے عجوبہ نہیں' اور کوئی شے عقل کو عاجز کرنے والی نہیں۔ قرآن کریم کا ہر دعویٰ ظن و قیاس کی بجائے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے' اس کی ہر تعلیم ریب و تشکیک کی بجائے اطمینان قلب کا باعث بنتی ہے' عقل و فکر کو عاجز کرنے کی بجائے نور بصیرت عطا کرتی ہے۔ یہ اشیائے کائنات اور مظاہر فطرت کو اعجوبہ بنا کر پیش نہیں کرتی بلکہ اس کے ہر عمل اور ہر شے قدرا مقدورا ہے۔(۱۷)۔ یعنی ہر شے کا وجود اور ہر عمل کا ظہور نپے تلے پیمانوں کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ یہ کتاب باطل کے ہتھکنڈوں سے بلکل محفوظ ہے۔(۱۸) ۔ اس میں کوئی انسان تحریف نہیں کر سکتا۔(۱۹)۔ فہم قرآن کے چند واضح اصول ہیں۔ مثال کے طور پر' عربی زبان کے قواعد و اسالیب' عربوں کی معاشرت' اور خطہ عرب کے طبیعی حالات کا علم۔ انسانی فطرت' تہذیب و تمدن اور ارتقائے فکر کے اصولوں سے آگاہی۔ تصریف آیات اور قرآن کریم کی کلی تعلیم پر عبور۔ اگر کوئی انسان ان چند اصولوں کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کو سمجھے گا تو اس پر حقیقت نکھر کر عیاں ہو جائیگی۔

اب جس انداز سے غامدی صاحب نے لفظ نملہ کو عربی زبان کے قواعد کی رو سے چیونٹی ثابت کیا ہے' وہ تو صحیح ہے لیکن بات بنی نہیں! آپ نے چونکہ فہم قرآن کے دیگر اصولوں کو نظر انداز کر کے صرف عربی زبان پر اکتفا کیا ہے اس لیے قرآن کریم کا اصل مفہوم واضح نہیں ہو سکا۔ جس سیاق و سباق میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے' اس کے مطابق یہ مفہوم دلیل و برہان کی کسی کسوٹی پر صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ماسوائے اس کے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے کمالات و کرامات کا مظہر سمجھ کر صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن یہ بات قرآن کے منشا کے خلاف ہوگی۔ اس ایمان کا کیا فائدہ جس سے نہ تو ذہن کو جلا ملے اور نہ قلب کو اطمینان حاصل ہو۔ ایسے عقائد سے نہ تو ذہن کی نشوونما ہوتی ہے اور نہ ہی معاشرے کی اصلاح اور ترقی پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ یہ کہ دینا کہ خدا جو چاہے کر سکتا ہے یا یہ کہ معجزات پر ہمارا ایمان ہے' قرآن کریم کی نگاہ میں فرسودہ عقائد سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسے عقائد نے نوع انسان کو سخت نقصان پہنچائے ہیں۔ قرآن کریم انسان کو اتنی بلند سطح پر لے جانا چاہتا ہے جہاں وہ اپنی سوچ و فکر کو بروئے کار لا کر صحیح فیصلے کرنے کے قابل بن جائے۔ اسی نملہ کو عقیدے سے نکال کر حقیقت کی طرف لئے آئیں اور چیونٹی کی بجائے اسے ایک مملکت کی سربراہ کی حیثیت سے سمجھیں تو بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ اس میں سبق بھی ہے اور ہدایت بھی۔ اور یہی قرآن کی منشاء ہے کہ ہم ہر واقعہ سے ہدایت حاصل کریں۔ ورنہ دیکھا جائے تو حضرت سلیمانؑ جب لشکر لے کر نکلے ہونگے تو ان کے دارالسلطنت سے لیکر وادی نملہ پہنچنے تک راستے میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں

چیونٹیوں کو روند ڈالا ہوگا لیکن کسی ایک نے بھی فریاد نہیں کی۔ آخر کیوں؟ کیا وہاں صرف وادی نملہ ہی میں چیونٹیاں آباد تھیں یا وہ بڑی سمجھدار تھیں کہ جیسے ہی حضرت سلیمانؑ کا لشکر وہاں پہنچا تو وہ اپنے بلوں میں گھس گئیں۔ آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ اس واقعہ میں علم و ہدایت کی کونسی بات ہے؟ اگر پرویزؒ صاحب نے یہاں نملہ کا مفہوم وادی نملہ کی ملکہ لیا ہے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ عربوں کی معاشرت اور کلچر میں مال مویشی اور جانوروں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہاں قبائل اوران کی آبادیوں کو جانوروں سے موسوم کرنا عام ہے۔ خطہ عرب میں آج بھی کئی قبائل اور بستیاں جانوروں کے نام سے موسوم ہیں۔ مثال کے طور پر کویت میں ایک قبیلہ ہے جسے المطیر ی کہتے ہیں۔ طیر عربی میں پرندے کو کہتے ہیں لیکن اس قبیلے میں ایک انسان بھی پرندہ نہیں۔ البتہ اس قبیلے کے افراد بہترین شہسوار' پھرتیلے اور گرم مزاج لوگ ہیں۔ شاید اسی لیے یہاں کے شاہی خاندان کی حفاظت کے لیے اس قبیلے کے افراد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی طرح کویت کے قریب ایک جزیرہ ہے جسے ام نملہ کہا جاتا ہے' اور سعودی عرب میں ایک کمرشل کمپنی موسسہ النملہ کے نام سے معروف ہے۔ کیا یہ چیونٹیاں ہیں؟

جیسا کہ عرض کیا ہے' غامدی صاحب کے مفہوم میں یہ اشکال اس لیے پیدا ہوئیں کہ آپ نے فہم قرآن کے مستند اصولوں کو نظر انداز کر کے صرف عربی زبان کے قواعد صرف ونحو سے سمجھنے کی کوشش کی۔ میری غامدی صاحب سے گذارش ہے کہ آپ اسم نکرہ اور اسم معرفہ وغیرہ کی بحث میں اسقدر نہ پڑیں کہ بات مضحکہ خیز بن جائے۔ صرف ونحو کے قواعد اپنے مقام پر صحیح معنی دیتے ہیں۔ انہیں ہر مقام پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ محاورے' استعارے' ضرب الامثال قوموں کی تہذیب وتمدن اور طبیعی ماحول میں جنم لیتے ہیں۔ یہ گرامر کے قواعد واسالیب سے بلند اور آزاد ہوتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں' الٹے بانس بریلی کو' تو اسے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں بریلی کے طبیعی حالات کا علم ہونا چاہیے۔ یہ گرامر کی رو سے سمجھ میں نہیں آئیگا۔ قرآن کریم سرزمین عرب میں نازل ہوا ہے لیکن اس کی ہدایت اور رہنمائی سے پوری نوع انسانیت نے مستفید ہونا ہے۔ لہذا' جتنی وسعت اس کے پیغام کی ہے اس سے کہیں زیادہ وسعت اس پیغام کو سمجھنے کے لیے چاہیے۔

پرویزؒ صاحب نے فہم قرآن کے سلسلے میں یہی اسلوب اپنایا۔ آپ نے عربوں کی تہذیب اور جغرافیائی حالات کا گہرا مطالعہ کیا اور عربی زبان کے جملہ اسالیب سے استفادہ کرتے ہوئے قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں' آپ کو قرآن کریم کی کلی تعلیمات' تصریف آیات' انسانی نفسیات' اور ارتقائے فکر کے تقاضوں پر بھی مکمل عبور حاصل تھا۔ قرآن کریم کا بنیادی موضوع فلاح

انسانیت ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان کا سفر زندگی اس دنیا میں بھی امن و سلامتی سے طے ہو اور وہ آخرت میں بھی فلاح و نجات پائے۔ یہی پرویزؒ صاحب کی تمنا تھی اور یہی تمنا ہر مخلص عالم دین کی ہوتی ہے۔ پرویز صاحب چاہتے تھے کہ تمام نوع انسان بالعموم اور امت مسلمہ بالخصوص اس کتاب عظیم سے استفادہ کر کے دنیا اور آخرت دونوں کو سنواریں۔ اس وقت تمام عالم میں انسان جس کرب و اذیت میں مبتلا ہے اور جن لاینحل مسائل کا شکار ہے' یہ سب مصنوعی اور انسان کی غلط سوچ وفکر اور غلط رہنمائی نے پیدا کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی انسان' کسی قوم' کسی بستی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ خود ظالم ہوتے ہیں اور نہ صرف دوسروں پر ظلم کرتے ہیں بلکہ اپنے نفس پر بھی ظلم کرتے ہیں۔(۱۸)۔

پرویزؒ صاحب ایک درد مند دل رکھنے والے انسان تھے۔ آپ نے امت کی زبوں حالی کو سامنے رکھ کر ان کے مسائل کا حل قرآن حکیم کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے سامنے نہ مال' نہ منصب' نہ منفعت کا حصول تھا۔ جو بھی علمی کاوش کی ہے خلوص نیت سے امت کی بھلائی اور منفعت کے لیے کی ہے۔ منافقت سے ان کا دامن بالکل پاک ہے۔ ان پر ایسے رقیق الزام لگانا کہ آپ نے قرآن کریم کے الفاظ میں تحریف کی ہے ایک سراسر بیہودہ بات ہے۔ اس میں کوئی صداقت نہیں۔ پرویزؒ صاحب کا جملہ لٹریچر کھلے عام دستیاب ہے۔ کوئی بھی صاحب علم اس تک رسائی حاصل کر کے اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ پرویزؒ صاحب نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو وہ کہتے ہیں وہی سچ ہے۔ آپ نے مفید تنقید اور مثبت بحث کے لیے اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے۔ ہیں۔ وہ تو ہمیشہ تاکید کرتے تھے کہ اپنی بات پر اصرار نہ کیا کرو۔ کوئی انسان کامل نہیں۔ انسانی فکر ارتقائی مراحل میں ہے۔ کیا صحیح اور کیا غلط ہے' اس کا فیصلہ آخری انسان ہی کرے گا۔ اپنی بات پر مصر رہنے سے انسان پر تحقیق و تجسس کے دروازے بند ہو جاتے ہیں' اور اقوام جہنم واصل ہو جاتی ہیں۔

و ما علینا الاالبلاغ

ملاحظات:

۱۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ تَعَالَوْاْ إِلَى مَا أَنزَلَ اللّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُواْ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لاَ يَعْلَمُونَ شَيْئاً وَلاَ يَهْتَدُونO (۵/۱۰۴)۔

۲۔ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لاَّ يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لاَّ يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لاَّ يَسْمَعُونَ بِهَا أُوْلَئِكَ كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُوْلَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونO (۷/۱۷۹)

۳۔ وَلَقَدْ جِئْنَاهُم بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَى عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونO (۷/۵۲)

۴۔ وَحَآجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللّهِ
وَقَدْ هَدَانِ وَلاَ أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلاَّ أَن يَشَاءَ
رَبِّي شَيْئاً وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْماً أَفَلاَ
تَتَذَكَّرُونَO(۶/۸۰)

۵۔ قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن
يَأْتُواْ بِمِثْلِ هَـذَا الْقُرْآنِ لاَ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ
بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراًO (۱۷/۸۸)

۶۔ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ
تَعْقِلُونO(۱۲/۲)

۷۔ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءنَا كَذَلِكَ يَفْعَلُونَ O
(۲۶/۷۴)

۸۔ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُواْ لَوْ شَاء اللّهُ مَا
أَشْرَكْنَا وَلاَ آبَاؤُنَا وَلاَ حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ كَذَلِكَ
كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم حَتَّى ذَاقُواْ بَأْسَنَا قُلْ هَلْ
عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِن تَتَّبِعُونَ إِلاَّ الظَّنَّ
وَإِنْ أَنتُمْ إَلاَّ تَخْرُصُونَO (۶/۱۴۸)

۹۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ
حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ O (۴۱/۵۳)

۱۰۔ مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَذَا
إِلَّا اخْتِلَاقٌ O(۳۸/۷)

۱۱۔ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّي
نَسْفاًOفَيَذَرُهَا قَاعاً صَفْصَفاًOلَا تَرَى فِيهَا عِوَجاً
وَلَا أَمْتاًO (۲۰/۱۰۵۔۱۰۷)

۱۲۔ أُوْلَـئِكَ عَلَى هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُوْلَـئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ O (۲/۵)

۱۳۔ وَلاَ تَهِنُوا وَلاَ تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الأَعْلَوْنَ إِن
كُنتُم مُّؤْمِنِينَO (۳/۱۳۹)

۱۴۔ مفہوم القرآن از غلام احمد پرویز،
صفحہ۔ز،تعارف۔

۱۵۔ وَلاَ تَهِنُوا وَلاَ تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الأَعْلَوْنَ إِن
كُنتُم مُّؤْمِنِينَO (۴/۸۲)

۱۶۔ قُرآناً عَرَبِيّاً غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ O
(۳۹/۲۸)

۱۷۔ اللّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنثَى وَمَا تَغِيضُ
الأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارO
(۱۳/۸)

۱۸۔ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ
تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدO (۴۱/۴۲)

۱۹۔ وَمَا كَانَ هَـذَا الْقُرْآنُ أَن يُفْتَرَى مِن دُونِ
اللّهِ وَلَـكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ
الْكِتَابِ لاَ رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَO (۱۰/۳۷)

۲۰۔ إِنَّ اللّهَ لاَ يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِن تَكُ
حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْراً عَظِيماO
(۴/۴۰)

و تمت کلمت ربک صدقا و عدلا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ڈاکٹر انعام الحق﴾

حکمت کی باتیں

(۱) (ارسطو) اگر انسان فضیلت سے معریٰ ہے' تو ایسا ناپاک اور وحشی جانور کوئی نہیں۔

(۲) (پرستش میں) دعا مانگنا تو بھیک مانگتا ہے۔

(۳) عصر حاضر میں چوری ایک مہذب ہنر بن چکی ہے' جس کا نام بدل کر ''کاروبار'' رکھ دیا گیا ہے۔

(۴) (ہرقلیس) تم ایک ہی دریا میں دو دفعہ قدم نہیں رکھ سکتے کہ ہر لحہ نیا پانی آتا رہتا ہے۔

(۵) مسرت خارجی اسباب اور ساز و سامان سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا سرچشمہ خود انسان کے اپنے بطون میں ہے۔

(۶) ایک دانشمند اور نیک شخص کے لئے تمام دنیا اس کا مادرِ وطن ہے۔

(۷) (فلاطینوس) میرا جسم میرے وجود کا ایک غیر اہم حصہ (اوزار) ہے' اس کی تصویر کھینچنا بے سود ہے۔

(۸) (سارتر) آخری اور قطعی آزادی جسے انسان سے چھینا نہیں جا سکتا ''نہ'' کہنے کی آزادی ہے۔

(۹) (حلیم پاشا) پھر جیسے نہ تو کوئی انگریزی ریاضیات ہے نہ فرانسیسی کیمیا' اسی طرح نہ تو ترکی اسلام کا وجود ہے' نہ عربی اور ہندی۔ وطنیت پر مبنی تہذیب کو انسان کے دورِ وحشت اور بربریت ہی کی ایک شکل تصور کرنا چاہئے۔

(۱۰) (سپائی نوزا) کوئی جذبہ ہی کسی دوسرے جذبے کو ہمارے ذہن سے باہر نکال سکتا ہے۔

(۱۱) ضمیر درحقیقت Society Internalised اور تقلید Society Divinised کا نام ہے۔

(۱۲) (ہابس) غیر مرئی قوت کا خوف انفرادی صورت میں توہم ہے اور اجتماعی صورت اختیار کر جائے تو مذہب بن جاتا ہے۔

(۱۳) جدلیات میں جو غلط ہوا سکی تردید خود اس سے کرائی جاتی ہے۔

(۱۴) اپنے ذہنی رویے کی دوسرے کے نظریات پر چھاپ لگا کر ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا صحیح نہیں۔

(۱۵) (ہیگل) صرف مطلق ذہن ہی مطلق حقیقت جان سکتا ہے۔ محدود ذہنوں کو اس تک پہنچنے کے لئے ہر ممکن سعی کرتے رہنا چاہئے۔

(۱۶) (افلاطون) کسی شخص کی اس سے بڑھ کر بدنصیبی کیا ہوگی کہ وہ عقل و خرد کا دشمن بن جائے۔

(۱۷) (ابیقورس) جب تم ہو گے موت نہیں ہوگی' جب موت ہوگی تم نہیں ہو گے۔

(۱۸) ہم اپنے دل میں یہ خیال نہ آنے دیں کہ دنیا مین کوئی دلیل صحیح اور معقول ہوتی ہی نہیں۔ اپنے اندر معقولیت کو پیدا کرنے کے لئے دماغی صحت کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے رہنا چاہئے۔

(۱۹) راحت سے مغلوب ہو جانے کے معنی جہالت ہے اور وہ بھی انتہا کو پہنچی ہوئی۔

(۲۰) اپنے آپ کو پہچانو۔ جب تک تم اپنے آپ سے واقف نہ ہو' ان چیزوں کو جاننے کی فکر کرنا جن سے تمہیں کوئی تعلق نہیں ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔

MATRIMONIAL

"A well off, Senior Engineer, working for Ford Motor Company in Detroit Michigan for more than 10 years, US Citizen, Age 51, First wife died, Has two Children, looking for an educated lady who understands and agrees to the Ideology of Tolu-e-Islam.
Please contact for further details: furqanalam@yours.com
US Mobile Phone: 01-248-506-2198"

Parents seeking Life partner for daughter

25-year British born Muslim, Pakistani origin, 5.4" tall, BSC in Computer Studies; employed by a prestigious company. Attractive, slim, intelligent, confident, warm and caring.

Suitor British born Muslim and resident of the UK, liberal, open mind, smart, sincere, confident, professional and or educated at degree level.
Send full personal credentials and family details via Email:
kh4n08@hotmail.com

اہم اعلان

ادارہ طلوع اسلام کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ طلوع اسلام کی

فی شمارہ قیمت 20 روپے

سال بھر کے لئے قیمت 225 روپے

(ادارہ طلوع اسلام)

BAZM-E-TOLU-E-ISLAM TORONTO

By

Abdus-Sattar Ghazali

asghazali@gmail.com

Dedication and commitment are two pre-requisites to make any organization, group or movement successful. The leaders and members of Bazm-e-Tolu-e-Islam Toronto have proved this with their sincerity and perseverance.

Bazm-e-Tolu-e-Islam Toronto was established in 1980 by Imran Shahid and Omar Farooq Atcha who was its first representative (President). Mr. Rahat Khan is the current representative of Bazm. He took over on January 1, 2008 from Mr. Abdul Rasheed Qureshi whose term of office ended on December 31, 2007. Engineer Yusuf Ali Zia, popularly known as Khanji, is the patron of the Bazm. He is with the Bazm since 1983 when he migrated to Canada after his retirement from Wapda.

During my three visits to Toronto in 2005, 2006 and 2007, I seized the opportunity to meet Bazm members at its monthly dars and was deeply impressed to see the dedication of Bazm members with its mission. Bazm members from near and far come regularly to attend monthly dars at Etobicoke Olympium center. Many come with their families. Winter is very harsh in Toronto. But harsh weather does not deter the dedicated members to continue their mission.

Mr. Abdul Rasheed Qureshi was proud to say that the Bazm began dars in 1980 soon after its establishment and these dars continue till today without any disruption. Since 2003 dars are being held at Etobicoke Olympium center to cater the need of increasing number of guests.

It will not be too much to say that it is the only active Bazm in North America which holds regular dars. There are two other Bazms in Ohio and New York which do not hold regular dars but work in coordination with Toronto. Enthusiasts from America often join dars in Toronto.

Bazm participates in local social and cultural events and puts up stalls with Islamic literature which attract a large crowd; Pamphlets are distributed free at these occasions.

Toronto Bazm produces independently audio and video CDs of the Quranic message of Allama Ghulam Ahmed Parwez. It also publishes pamphlets in English too.

Well aware of the needs of the young generation of Muslims in North America, the Bazm is also involved in translation of Allama's Urdu work into English. It also plans to begin dars in English and English subtitling of Allama's videos is also on the cards with the cooperation of Dr Hamid Mian (New York) and Dr Mansoor Alam (Toledo Ohio).

It has an ambitious plan to open an Islamic School to educate the young generation about the thoughts of Allama Parwez.

In 1986, Toronto Bazm began publication of a newspaper in Urdu to disseminate its message. However, the paper did not bring the desired results and it was discontinued in 1988 while its resources were used to publish ads in local newspapers and radio programs.

The Bazm also sponsored a radio program for eight years till August 2005. It plans to begin again a 30 minute radio programs. It is also trying to begin a TV program.

Allma's message is spreading

Mr. Imran Shahid, one of the founder member of Bazm-e-Tolu-e-Islam Toronto, was happy to point out that in many local newspapers articles are published in which material from Allama Parwez's books is being used. Particularly, the term Din is being used in the same meaning as is used by Allama. He said that often in religious discussions, people use the arguments or point of view of Allama without quoting him. "It is a matter of great satisfaction for us that that Allama's message is spreading, although people are shy to name him," said Mr. Shahid.

Toronto Bazm has a democratic set up. One Numaenda (Representative) cannot be elected for more than two consecutive terms. It holds monthly meetings to review progress of its mission; its setup is very democratic.

At monthly dars, speakers are brought from outside to enlighten the members. Among the speakers hosted by the Bazm in Toronto are: Mr. Mirza Khalil Ahmed , ex-Nazim Idara-e-Tolu-e-Islam, Lahore; Mr. Ubaidur

Rehman, Vice Chairman Idara-e-Tolue Islam and Surraya Andaleeb, Ex Representative Bazm Lahore (Khawateen), Dr Mansoor Alam Bazm Toledo Ohio, Dr Hamid Mian Bazm New York and Professor Khalid Salam ex-Numinda Bazm Lahore.

Exhibition of Tolu-e-Islam publications are exhibited at the monthly dars while pamphlets are distributed free of cost and dars ends with refreshments.

Yearly, a Khososi Dars (Special Dars), is organized and presented once a year in a large Toronto down Town Auditorium. It takes months to prepare this event with extensive publicity in the community news papers, radio and TV extending invitation to people from Greater Toronto, Visitors from Montreal, Ottawa and also the associates of Bazm New York, Toledo Ohio attend these Khososi dars.

At previous Special Dars programmes, brief presentations were given in the first half by Dr Hamid, Dr Mansoor Alam, Dr Tahira Akram, Professor Khalid Salam. After live presentations, video dars of Allama Parvez is presented which is received with applause from the audience. Khososi Dars concludes with an exhibition of Tolu-e-Islam publications and big refreshment including hot and cold beverages with free distribution of pamphlets.

The Rand Corporation

This summer I had the privilege to address a Bazm gathering on the western conspiracies against Islam and its holy book, the Quran, by such groups as the semi-official American think tank The Rand Corporation. Here is a brief of my talk:

In 2004, the Rand Corporation issued a report, titled *Civil Democratic Islam: Partners, Resources, and Strategies*, that questions the authenticity of the Quran itself. The Rand Corporation encourages Muslim "modernists" to believe that the Quran is a legend and that some verses (suras) may have been falsely or inaccurately recorded in the Quran. The report arbitrarily divided the Muslims into four categories:

1. Fundamentalists, who reject democratic values and contemporary Western culture.
2. Traditionalists, who want a conservative society. They are suspicious of modernity, innovation, and change.

3. Modernists, who want the Islamic world to become part of global modernity. They want to modernize and reform Islam to bring it into line with the age.
4. Secularists, who want the Islamic world to accept a division of church and state in the manner of Western industrial democracies, with religion relegated to the private sphere.

The Rand report suggests that Modernists are our allies in the Muslim world because this group is most congenial to the values and the spirit of modern democratic society. Modernism, not traditionalism, is what worked for the West. This included the necessity to depart from, modify, and selectively ignore elements of the original religious doctrine.

The report further argued that the Old Testament is not different from the Quran in endorsing conduct and containing a number of rules and values that are literally unthinkable, not to mention illegal, in today's society. "This does not pose a problem because few people would today insist that we should all be living in the exact literal manner of the Biblical patriarchs. Instead, we allow our vision of Judaism's or Christianity's true message to dominate over the literal text, which we regard as history and legend. That is exactly the approach that Islamic modernists also propose."

With the objective of selectively ignoring elements of the original religious doctrine of Islam the Rand Report also defines parameters for a Muslim modernist:

- Modernists believes that Islam is responsible for the underdevelopment of the Muslims because prosperity and progress depends on modernity and democracy.

- Who believes in the historicity of Islam, i.e., that Islam as it was practiced in the days of the Prophet reflected eternal truths as well as historical circumstances that were appropriate to that time but are no longer valid.

- Modernists do not regard the original Islamic community or the early years of Islam as something that one would necessarily wish to reproduce today.

- Modernists believe that some verses (suras) may have been falsely or inaccurately recorded in the Quran.

- Modernists believe that the Quran is a legend.

Alarmingly, the report also questions the authenticity of the Qu'ran itself. In chapter on "The Hadith Wars" the author of the Rand Report Sheryl Benard says that two verses were lost in the process of recording of the Quran after the death of the Prophet (PBUH).

To authenticate her argument, Benard quotes from chapter 11 of Allama Ghulam Ahmed Parwez's book *The Status of Hadith.* Ironically, this chapter - *Holy Quran According to Our Traditions* - is written to refute the premise that the Quran was recorded after the death of the Prophet (PBUH). The references of Hadith in this chapter were given for the argument sake which Benard misquoted to prove her argument. Allama Parwez points out that the Quran was recorded in its present shape during the lifetime of the Prophet (PBUH). He questions the authenticity of collections of Hadith which were collected by the Persian scholars more than 200 years after the death of the prophet.

Other groups

Besides the Rand Corporation, another US group, established in the name of International Quranic Center, is dedicated to interpret Islam in accordance with the American society. Structure of this center will indicate its hidden agenda. Irving Sptizber, a Jew, is its president while Camel Haleem, a Coptic Christian, is its vice chairman.

The center's president is Dr. Ahmed Mansour, an Egyptian who was Professor of Muslim History in the College of Arabic Language at Al Azhar University in Cairo from 1980 to 1987. He was sacked because of his controversial writings on Islam. The Quranic center propagates books and articles written by Dr. Mansour who has taken refuge in US.

We see another conspiracy against Islam with a Coptic Christian link. In 1974, the Muslim world was thrilled by a premise that the Quran is mathematically coded and 19 is a miracle figure in the Quran. This theory was proposed by Rashad Khalifa an Egyptian-American as assuring evidence that it is indeed the word of God because such mathematical coding is beyond human capability. However, his mathematical theory was not new. He had stolen this theory from the 12th century Rabbi Judah who had also claimed that the Old Testament is based on the figure of 19. But who was Rashad Khalifa. Very few people know that his real name was Richard Caliph. He was a Coptic Christian.

Rashad Khalifa published an English translation of the Quran in which he deleted the last two verses of Sura Tuba about which he claimed that these two verses were added 19 years after the passing away of Prophet Mohammad (PBUH). In 1988 he claimed that he was a messenger of God. And two years later, in January 1990, Rashad Khalifa was assassinated in the Tuscon Mosque in Arizona shortly before dawn. His followers call themselves as "submitters," and their group is named United Submitters International.

[Abdus Sattar Ghazali, an author and journalist, is a resident of Modesto, California.]

****

WORKING TOGETHER: SOME THOUGHTS AND REFLECTIONS

By

Mansoor Alam

Here is a parable. The narrative seems all too familiar.

Once upon a time there was a community that lived in relative peace and tranquility. People worked together. They got along pretty well and trusted each other. More or less everyone in the community felt happy and contented. By and large corruption was missing from this community. So were such psychological ills as prejudice, ego, or envy among its people.

There was transparency and accountability in their decision making. Difference of opinion was not only tolerated but was considered an asset. People deeply respected each other no matter what their differences. They conducted their business in a civilized and peaceful manner. As a consequence, this community prospered and flourished like no other community around them… Then something happened.

Some 'holier-than-thou' individuals were not satisfied by the prevailing peace and tranquility in the community and the overall solidarity and openness in its ranks. They felt tradition and spirituality were missing from the picture. To them the community was too progressive, too liberal. These individuals felt obliged to do something about it.

They, therefore, eyed for the leadership of the community. First, these individuals brainwashed people into believing that they were the community's real well wishers. Promising to work for the welfare of the community and claiming to promote spiritualism these individuals were easily able to garner people's sympathy and support for their ulterior motives.

The situation started deteriorating though for the people when these few individuals started exerting their new leadership over the community. As it is usual, most people preferred to remain complacent and ignored the early warning signs. And by the time they did realize what had happened it

was too late. The community as a whole felt powerless and weak, and divided.

In the mean time the neighboring community was carefully watching what was happening to this community. When the time was ripe they took over this community. Since it had become weak and divided it was an easy prey for its neighbor. Like opportunists waiting in the wings they grabbed the fruits of other's labor. The Qur'an says this is the result of not being thankful to Allah for His blessings in the first place (16:112).

The above parable repeats time and again in real life. That is why the Qur'an narrates such parables for us as lessons in human discourse. Past history of various peoples are examples of this in one form or the other too numerous to mention. Sadly, Muslims have fallen into this category.

However, nothing could be gained by lamenting at this situation as we often do. Our usual emotional reaction does not help the situation either. On the other hand, maintaining status quo works in favor of the traditionalists (followers of forefathers according to the Qur'an) and against the common people.

So what to do? Whether we like it not, we are forced to interact with each other regardless of our views. Therefore, there is bound to be friction. However, pushing to the right or left as is normal in such cases, only cause further friction. How to strike a proper balance between these complex human interactions and maintain forward movement is the key for long term peace and stability.

However, it is not easy. People have been struggling with this issue throughout human history; because, when we work collectively we face problems that often frustrate us. Even if we agree on a common goal we often find it difficult to reconcile our differences in realizing that goal. Allah made us diverse for a reason: We have to *earn* our humanity.

How then can we work together towards this higher goal despite our pluralism? How should we value and weigh each other's opinions despite our diversity? How do we check our personal interests and ambitions from interfering with our collective interest? What factors hinder us from working together as a cohesive team?

These are complex questions and there are no simple answers. However, there is one factor that encompasses all these questions, and that is our ego. It feels very mysterious but its manifestations are very real. No one

can deny that our ego comes into play consciously or subconsciously when we work together. We cannot avoid it or get rid of it no matter how much we may try. It is very easy for our ego to control us without our even being conscious of it. Moreover, we easily fall prey to our egos and, ironically, we tend to feel good about it. This is the real problem with the ego.

Nevertheless, we should note that nobility is rooted in humility. The Prophet (PBUH) was a very humble person. So, we must try to check our ego. But such is the grip of our ego on our hearts and minds that we often feel helpless in subduing it. In any case, no matter how difficult it may be we have to wage this battle against our ego in order to humble it. That is why our Prophet (PBUH) termed this struggle as the higher jihad. This is *the* only way we would be able to get in touch with our true inner selves and be closer to Allah.

But there is something else. We must always remain on guard from the mischief of the whisperer who comes quietly and blows an air of suspicion into the hearts of people and withdraws (114: 4-5). The Qur'an – the final, the eternal, the complete, and the unchangeable Book of Allah – ends with these verses. That must tell us how important it is to be on guard from such whisperers.

That would enable us to harness the creative energy that flows within us for the higher good. Only then would we be able to make the best use of the synergy that comes into play when we work together in a spirit of cooperation based on mutual respect and trust. If that happens there is no way a community, a people, or a nation cannot but prosper materially *and* spiritually.

****